اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۲

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

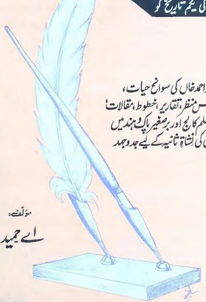

سر سیّد احمد خاں کی سوانح حیات،
عہد کا پس منظر، تقاریر، خطوط، مقالات،
علی گڑھ مُسلم کالج اور برصغیر پاک و ہند میں
مُسلمانوں کی نِشاۃِ ثانیہ کے لیے جدوجہد

مؤلف:

اے حمید

۱۲
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

اُردو ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی
ایک خصوصی پیشکش

اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۲

سر سید احمد خان کے سوانح حیات، عہد کا پس منظر،
تقاریر، خطوط، مقالات، علی گڑھ مسلم کالج اور برصغیر
پاک و ہند میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے جدوجہد

مؤلف
اے حمید

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مدیر مسئول : ارشد نیاز
مدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - اشتیاق احمد

آرٹسٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی۔ لاہور

فون نمبر :
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۲۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

سرسید احمد خان

اِس وقت "اُردو نثر کی داستان" کی قسط ۱۲ آپ کے سامنے ہے۔ اِس کتاب میں سرسید احمد خان کے سوانح حیات، اُن کے عہد کا پس منظر، ان کی تصانیف، تقاریر، مکاتیب، مقالات، علی گڑھ مسلم کالج کے قیام اور برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اُن کی جدوجہد کو مستند حوالوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خان نے اپنے ملک و قوم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں اُنہیں ہمیشہ بنظرِ استحسان دیکھا جاتا رہے گا۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں جو انتھک محنت اور جدوجہد کی ہے اُس کا بھلا دینا مشکل ہے۔

سرسید کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے تاہم اِس سلسلے میں یہ کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ انہوں نے ذاتی مفاد سے بالا ہو کر ایک قومی جذبے کے تحت مُلک و قوم کے مفادات کے لیے وہ کچھ کیا جسے اُس دَور میں کوئی بھی نہ کر سکتا تھا۔ اپنی ذات کو معدوم کر کے قوم کی اجتماعی سربلندی کے لیے سرتوڑ کوشش کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر آپ ہماری رائے سے ضرور اتفاق کریں گے۔

مؤلف کی کاوش قابلِ تعریف ہے کہ اُنہوں نے سرسید احمد خان کے بارے میں مواد اکٹھا کرتے ہُوئے اُن کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کو بھی تشنہ نہیں رہنے دیا۔ مستند حوالوں کے ساتھ نہایت خوبصورت انداز میں ایک محبِّ وطن اور محبِّ قوم شخص کا چہرہ دکھایا ہے۔

قارئین ! "اُردو نثر کی داستان" کے ساتھ ہی آج ہم ایک خوبصورت کتاب "ہر دلعزیزی" بھی آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ کتاب ضرور آپ کو فائدہ پہنچائے گی۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے اور لوگوں میں ہر دلعزیز ہونے کے سنہری اُصول اِس کتاب میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ آپ اِس کتاب کو یقیناً پسند فرمائیں گے۔

نیاز احمد

سرسید کے آباؤ اجداد

سرسید احمد خاں دہلی میں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء بمطابق ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہجہان کے دور میں ہندوستان میں آئے تھے۔ آباؤ اجداد کا سلسلہ نویں امام حضرت امام محمد تقی علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو تقوی سید بھی کہا کرتے تھے۔ سرسید کے دادا کا نام سید ہادی تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں، کہ سرسید کے بزرگوں میں سے ایک شخص سید محمد دوست دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے شانہ بشانہ تھے، وہ ایک مورچے میں تھے۔ انہوں نے اس مہم میں بہادری کے وہ جوہر دکھائے، کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کو یکہ بہادر کا خطاب عطا کیا۔ سرسید کے دادا سید ہادی کو عالمگیر ثانی نے جواد علی خاں کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور ان کو منصب ہزاری ذات اور پانچ صد سوار ملا۔ ان کے بھائی سید مہدی کو بھی یہی منصب اور قباد علی خاں کا خطاب ملا۔ قباد علی خان کا انتقال دکن میں ہوا۔ سرسید کے دادا دہلی ہی میں رہے۔ سرسید کے دادا کو شاہ عالم بادشاہ نے جواد الدولہ کا بھی خطاب عطا کر دیا۔ ان کا انتقال دہلی ہی میں ہوا۔

بقول سرسید ان کے دادا فارسی زبان میں شعر کہا کرتے تھے، اور ان کے پاس اپنے دادا کے فارسی کلام کا ایک مکمل دیوان تھا، جو غدر کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا سرسید کے والد کا نام میر متقی تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے خطابات انہی کو ملنے تھے، لیکن انہوں نے قبول نہ کئے۔ سرسید کے والد کے تعلقات اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے میں ہی تھے، اور شاہزادے کو میر متقی سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ چنانچہ شاہ عالم کے انتقال کے بعد سرسید کے والد کا اثر و رسوخ دربار میں بڑھ گیا۔ وہ دربار میں بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ اور اکبر شاہ کے ساتھ مراسم بڑے خصوصی ہو گئے تھے۔

چنانچہ سرسید کہتے ہیں کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ نیز تنہا بھی خاص دربار میں گیا ہوں"۔ سرسید کے والد کو حضرت شاہ غلام علی سے بیعت تھی۔ شاہ صاحب کی خانقاہ دہلی میں مرجع خلائق عام ہے۔ شاہ صاحب بھی ان سے بڑی محبت کیا کرتے تھے۔

سرسید کی ننھیال

سرسید کی ننھیال کا تعلق خواجہ میر درد کے خاندان سے بھی تھا۔ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانیؒ کی اولاد میں تھے۔ آپ کے بھائی نجیب الدین نواح دہلی میں "شاہ فدا حسین" کے نام سے مشہور تھے۔ یہ بڑے خوش بیان اور صاحب علم تھے۔ آخر میں وہ "رسول شاہی" فرقہ میں آ گئے، اور چار ابرو کا صفایا کر کے ایک غرقی باندھے، بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ سرسید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ خاندان میں سب سے زیادہ لائق اور صاحب علم و فضل تھے۔ ریاضیات میں انہیں بہت عبور حاصل تھا۔ انہوں نے علم ہیئت پر چند رسالے بھی لکھے تھے۔ چنانچہ ایک رسالے کا ترجمہ سرسید نے بھی کیا تھا سرسید کے ماموں کا نام زین العابدین خاں تھا۔ یہ بھی علم ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ اور فورٹ ولیم کالج میں بمشاہرہ سات سو روپے ماہوار ملازم تھے۔ کچھ عرصہ وہ ایران میں سفارتی عہدے پر بھی فائز رہے۔ برما میں پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہے۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے وزیر سلطنت کے عہدے پر فائز کیا، اور دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کا خطاب عطا کیا۔ یہ بھی رسول شاہیوں میں شامل تھے، مگر چار ابرو کا صفایا صرف مرنے سے دو سال پہلے کروایا۔

سرسید کی والدہ

سرسید کی والدہ نہایت حلیم الطبع، دانش مند، نیک دل اور پاک سرشت خاتون تھیں۔ ان کی تربیت کا سرسید پر خاص اثر ہوا۔ سرسید کی والدہ صاحبہ کا خاندان شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا معتقد اور مرید تھا۔ لیکن وہ خود شاہ غلام علیؒ سے ارادت رکھتی تھیں۔ ان کی خانقاہ میں نذر نیاز، تعویذ گنڈے کا رواج نہ تھا۔ اس لئے سرسید کی والدہ بھی ان چیزوں کی قائل نہ تھیں، لیکن ان سے منکر بھی نہیں تھیں۔ سرسید فرماتے ہیں:

"میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے، مگر شاہ عبدالعزیزؒ کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا، اس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے ہاں کے بزرگ بچوں کو گنڈا دیا کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا، جس میں ایک ہندسہ یا حرف، سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ جس بچے کو یہ دیا جاتا تھا، اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود (سرسید کے بیٹے) کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے، اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی، تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں"۔

سرسید کے بھائی کا انتقال

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خان منصف بنگام ضلع فتح پور کا انتقال ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ سید محمد خان بھی شاہ غلام علی سے بیعت تھے، اور بڑے پاک باطن انسان تھے۔ دسہرے کی چھٹیوں میں دہلی آئے تھے، وہاں بخار کی وبا عام تھی۔ سید محمد خان کو بھی بخار نے آن لیا۔ ان کو یقین ہو گیا کہ آخری وقت قریب ہے۔ چنانچہ اسی حالت میں وہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ گئے۔ اپنی قبر کے لئے جگہ پسند کی اور واپس آ گئے۔ جب قبر تیار ہو چکی، تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ قبر میں اتر کر لحد کے اندر لیٹ گئے اور بہت پسندیدگی کا اظہار کیا۔ گھر واپس آ گئے۔

دوسرے روز کفن کے لئے کپڑا منگوایا، سلوا کر کفن پہن کر دیکھا، اور اسے بھی بہت پسند کیا۔ پھر ایک روز حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ کو بلوا بھیجا۔ شاہ احمد سعید سید محمد خاں کے پیر و مرشد کے سجادہ نشین تھے۔ ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی، اور اس کے ٹھیک تین دن بعد انتقال کر گئے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے جو سرسید کو ان کے بھائی کی تعزیت کا خط بھیجا تھا، اس میں یہ شعر لکھا:

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت
مرگے کہ زندگان بہ دعا آرزو کنند

سرسید کی تعلیم

سرسید احمد خاں کی رسم بسم اللہ بھی شاہ غلام علی صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں عمل میں آئی۔ سرسید کو شاہ صاحب سے بسم اللہ پڑھنے پر بڑا فخر تھا۔ اب تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید کے بعد عربی اور فارسی پڑھی۔ صرف و نحو۔ معانی و بیان و بدیع، منطق و فلسفہ، ریاضی اقلیدس، ہیئت۔ تمام علوم میں بصیرت پیدا کی۔ سرسید نے علم طب بھی پڑھا، اور کچھ دیر مطب بھی کرتے رہے۔ دہلی میں جو اہل علم فارسی دانی میں نامور تھے، جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ، ان سے ملنے اور ان کی علمی و ادبی مجلسوں میں شرکت کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ملازم ہو کر جب فتح پور سے بدل کر دہلی میں آئے، تو مولوی نوازش علی دہلی کے مشہور عالم و واعظ سے تکمیلی پڑھائی کو تلمذ کیا۔ فقہ و اصول

فقہ ان سے پڑھا۔

مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے سبعہ معلقہ اور مقامات حریری پڑھے۔ شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے مولانا مخصوص اللہ سے حدیث پڑھی۔ پھر انہیں سے قرآن مجید کی تسند لی۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنا مطالعہ بھی جاری رکھا۔

ایک واقعہ

سرسید کے شوقِ علم کا یہ واقعہ یادگار ہے۔ جب وہ دہلی سے قائم مقام صدر امین ہو کر رہتک جانے لگے، اس وقت مولوی نوازش علی سے تکمیل علم کر رہے تھے۔ مولوی صاحب سے کہا، آپ میرے ساتھ چلئے انہوں نے عذر کیا کہ میرے پاس بہت سے طالب علم ہیں، ان کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ سرسید نے کہا، سب کو لے چلئے، ان کے اخراجات کا میں ذمے دار ہوں۔ مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے۔ آخر سرسید مولوی صاحب کو اور ان کے سب شاگردوں کو لے کر چلے گئے۔ اور جب تک رہتک میں رہے، سب کے اخراجات کے کفیل رہے۔

اور یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ فازی پور میں سرسید کے پاس ایک یہودی سالم نام صنعا کا رہنے والا آیا، اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش میں پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسید نے پوچھا، کیا تنخواہ لوگے؟ اس نے دس یا پندرہ روپے کہے۔ سرسید نے کہا، میں تم کو پچیس روپے مہینہ دوں گا۔ مجھے عبرانی زبان سکھاؤ۔ یہودی نے یہ سُن کر خوشی کے مارے، بڑھ کر سرسید کی ڈاڑھی چوم لی، اور کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا، جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اسے نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ یہودی بہت زیادہ خرچیلا اور آوارہ مزاج تھا، اس لئے اس کو بقدر ضرورت دیتے رہے، اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا، تو کئی سو روپیہ جو اس کا جمع تھا، حساب کر کے واپس کر دیا۔

عہدِ شباب

سرسید کا عہدِ شباب رنگین صحبتوں میں گذر بسر ہوا۔ باغوں کی سیر، کھیل تماشے، راگ رنگ کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے خود بھی بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ دہلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نہایت حسین تھی۔ مگر اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک محفل میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی، سرسید بھی تھے۔ وہیں اسی محفل میں ان کے ایک قند ہاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے:

"مادرش بسیار تلخ است" سرسید نے فوراً جواب دیا:

"گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد"

لیکن اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد سرسید کا دل ان رنگین صحبتوں سے اچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا۔ یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوا لیا۔ ڈاڑھی چھوڑی، پائنچے متشرع کر لئے، کرتا پہن لیا۔ رنگین طبع لوگوں کی صحبت رفتہ رفتہ ترک کرنی شروع کر دی۔ اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھتا گیا۔

سرسید کی ملازمت

سرسید کے والد کو قلعہ شاہی سے تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد وہ آمدنی بند ہو گئی۔ اب ان کو سرکار انگریزی کی ملازمت کا خیال آیا۔ سرسید کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں دلّی میں صدر امین تھے۔ انہوں نے ۱۸۳۸ء میں سرسید کو کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ پھر فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری آگرہ کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے۔ وہیں منصفی کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری میں جج مقرر ہو گئے۔ ایک سال بعد فتح پوری سے فتح پور سیکری آ گئے۔ اور وہاں چار برس جج رہے۔ فتح پور سیکری جہاں اکبر بادشاہ کی خواب گاہ تھی، حسن اتفاق سے وہی عالیشان مکان سرسید کو رہنے کے لئے ملا۔ سرسید چار برس اسی مکان میں رہے۔

اسی زمانے میں بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی نے سرسید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے سفارش کی۔ بادشاہ نے سرسید کو بلا کر "جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ" کا خطاب عطا کیا، اور خطاب ملنے کی تمام رسومات ادا کی گئیں۔ ۱۸۴۶ء میں فتح پور سیکری سے تبدیل ہو کر دہلی آ گئے۔ یہاں سے دوبارہ قائم مقام صدر امین ہو کر رہتک گئے۔ پھر ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس گزرے تھے کہ غدر ہو گیا۔

غدر اور سرسید

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء بہ مطابق ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو دہلی میں بغاوت ہوئی۔ اور ۱۲ مئی کو یہ خبر بجنور پہنچی۔ یہاں اس وقت بیس یورپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ مسٹر شکسپیر مجسٹریٹ اور کلکٹر تھے۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے، تو یہ لوگ بہت گھبرائے۔ لیکن سرسید نے جا کر ان کی تشفی کی، اور کہا۔

"جب تک ہم زندہ ہیں، آپ کو ہرگز گھبرانا نہیں چاہیئے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے، اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں"

چنانچہ سرسید مع اور ہندوستانی افسروں کے تمام رات مسلح ہو کر کلکٹر کی کوٹھی پر پہرہ دیتے رہے۔ ساری رات کرسیوں پر بیٹھے، یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے، یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی۔ آخر کار باغیوں کو نشیب و فراز سمجھا کر انگریزوں کے قتل سے باز رکھا۔ اور سب کو رڑکی روانہ کر دیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بجنور میں باغیوں کی عملداری ہو گئی تھی۔ اور وہ لوگ جانتے تھے کہ سرسید نے انگریزوں کو بجنور سے بھگا دیا ہے۔ چنانچہ وہ سرسید اور اس کے خاندان کے دشمن ہو گئے۔

مگر سرسید نے پروا نہ کی، اور ایک مہینے تک بجنور کا انتظام بخوبی قائم رکھا۔ لیکن باغی ان کی اور ان کے رفقائے کار کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ چنانچہ ایک روز سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں میرٹھ کے ارادے سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں کئی ایک مقامات پر باغیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اور انہوں نے سرسید اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ہر موقع پر بعض خیر خواہ زمینداروں نے بچا لیا۔ اثنائے راہ میں چاند پور سے چل کر سرسید نے بچھراؤں پہنچ کر علالت اور راستے کی کوفت کے سبب سے چند روز مولوی محمود عالم صاحب کے مکان پر، جو ان کے دوست تھے، قیام کیا۔ اور اپنی مفصل سرگزشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی، اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔

سرسید میرٹھ میں کئی مہینے رہے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دہلی میں انگریزی فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور سارا اسباب لوٹ لیا۔ ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی مارے گئے۔ ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں۔ سرسید میرٹھ سے دہلی آئے گھر تباہ ہو چکا تھا۔ ماں اور خالہ کو میرٹھ لے گئے۔ انگریزوں نے رڑکی میں اپنی فوج جمع کر لی۔ سرسید بھی تمام عملۂ بجنور کے ساتھ بحکم سرکار رڑکی بلائے گئے۔ تمام

روہیل کھنڈ سخت باغی تھا۔ بجنور، مراد آباد، بریلی کے ضلعے سرکشوں کے زیرِ اثر تھے۔ ان اضلاع پر قبضہ کرنے کے لئے رڑکی سے فوج روانہ ہوئی۔ سر سید بھی ساتھ تھے اس موقع پر سر سید نے کمال دلیری اور دانشمندی سے کام لیا۔ حکام سرکاری میں یہ بحث ہو گئی کہ اب ان اضلاع سرکش میں کون لوگ باغی تسلیم کئے جائیں۔ سر سید نے اس باب میں فوجی افسران سے گفتگو کی۔ اور آخر بہت بحث مباحثے کے بعد یہ طے کرا لیا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف وہ لوگ قرار پانے چاہئیں، جو اب سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو فسادات رعایا، ہندو یا مسلمان دونوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں کئے، ان کے سبب سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سر سید اگر یہ جرأت نہ کرتے، اور یہ فیصلہ نہ کرا دیتے تو ضلع بجنور بالکل تباہ ہو جاتا۔ خاص طور پر مسلمان ایک بھی اس علاقے میں زندہ نہ رہتا۔ سر سید کی اس دانش مندی کی وجہ سے ضلع بجنور غدر کے نتائج میں سب سے کم مبتلا ہوا۔ اور ضلع مراد آباد میں ضبط شدہ جاگیریں سب سے زیادہ واپس کی گئیں۔

خدمات غدر کا صلہ

سرکار انگریزی کی خیر خواہی اور وفاداری جو سر سید سے ظہور میں آئی، وہ کسی خلعت یا انعام کی توقع پر مبنی نہ تھی لیکن گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی قدر کی، اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا، اور دو سو روپے ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔ میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاندپور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔ اور جس طرح دیگر خیر خواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائیدادیں دی گئی تھیں۔ یہ تعلقہ چاندپور سرکار نے سر سید کو دینا چاہا، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

سر سید نے خود ایک مرتبہ اس کے متعلق کہا تھا:

"بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا، تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو، اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔"

غدر کے بعد

"حیات جاوید" کے حوالے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد اپریل ۱۸۵۸ء میں سر سید صدر الصدور ہو کر مراد آباد گئے۔ یہاں چند کتابیں لکھیں۔ ۱۸۶۰ء میں وہاں سخت قحط پڑا۔ قحط کا انتظام سر سید نے ایسی خوبی سے کیا کہ انسانی ہمدردی کا اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے۔ قحط زدوں کی سرکاری امداد کے علاوہ خود سر سید کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔ مراد آباد کے ایک عالم اور رئیس مولوی غلام علی کو بغاوت کے الزام اور سزائے موت سے بچایا۔ مولوی صاحب نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے مکان میں پناہ دی تھی۔ باغیوں نے زبردستی گھر گھس کر ان سب کو ہلاک کر دیا۔ اور مولوی صاحب کے گھر کا کوئی آدمی نہ مارا گیا۔ ان پر الزام یہ لگایا گیا کہ ان کے اشارے سے یہ قتل عمل میں آیا۔

سر سید نے مولوی صاحب کی بے گناہی ثابت کر کے بری کرا دیا۔ چار برس کے بعد ۱۸۶۲ء میں سر سید کی بدلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی۔ وہاں بھی علمی و تعلیمی کام کرتے رہے۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے علی گڑھ کو تبدیل ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں عہدہ جج خفیفہ پر ترقی پا کر علی گڑھ سے بنارس گئے۔ اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے انگلستان روانہ ہوئے۔ دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود ساتھ تھے۔ سفر کا مقصد سید محمود کی تعلیم کے علاوہ ولایت کے طریقہ تعلیم کا مطالعہ و مشاہدہ تھا۔ لندن میں ان کو سی ایس آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ مشاہیر و عمائد ملک سے ملاقات کی۔ ملکہ وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کے دربار عام میں شریک ہوئے۔ بعض کلب کے ممبر بنائے گئے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں کتب خانوں اور کارخانوں کو غور سے دیکھا۔ ان سب باتوں کے سوا سر سید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کو لکھنا، اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرنا تھا، جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاص کر سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر صوبہ شمال مغرب نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اسلام کی حقیقت اور بانیٔ اسلام کی سیرت پاک کے متعلق کی ہیں، ان کو رفع کیا جائے۔ چنانچہ سر سید نے لندن میں ایک مختصر رسالہ انگریزی میں شائع کیا۔

ولایت سے واپس آ کر سر سید نے مفصل کتاب اردو میں چھپوائی۔ ولایت میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر سر سید مع بڑے بیٹے سید حامد کے اکتوبر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان آ گئے۔ اور بنارس میں اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ بنارس ہی کے زمانہ قیام میں ۱۸۷۵ء میں ایک ابتدائی مدرسہ علی گڑھ میں قائم کیا۔ اور پھر جولائی ۱۸۷۶ء میں پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ میں رہنے لگے۔

سر سید کی وفات

پنشن کے بعد ۲۲ برس ہمہ تن قومی خدمات میں مصروف رہ کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو دس بجے رات کے علی گڑھ میں انتقال کیا، اور کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔

سر سید کے اعزازات

شاہی خطاب جواد الدولہ عارف جنگ کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ سرکار انگریزی نے سی ایس آئی کے بعد ۱۸۸۸ء میں کے سی ایس آئی کا خطاب دیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی نے ۱۸۸۹ء میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ لندن جانے سے پہلے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو گئے تھے۔ لندن میں وہاں کے سب سے زیادہ نامی اور معزز کلب ایتھی نیم کلب کے ممبر بنائے گئے۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ اور چار برس تک ممبر رہے۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے ممبر ہوئے، اور شہادت دی۔ ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔

سر سید کی قومی خدمات

سر سید نے ہنگامہ غدر کے سلسلے میں اپنے ملک و قوم کی جو خدمات سر انجام دیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے لئے عموماً اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً فلاح کی جدوجہد شروع کر دی۔ تعلیمی میدان میں انہوں نے ـــــ

۱: ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا۔

۲: اسی سال رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔

۳: ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔

۴: اسی سال غازی پور میں انگریزی مدرسہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے قائم کیا۔ غازی پور سے علی گڑھ بدلی ہوئی، تو سوسائٹی کا دفتر بھی ساتھ آ گیا۔ علی گڑھ میں اس کے لئے تیس ہزار روپیہ لاگت سے عمارت اور باغ تیار ہوا۔ اس میں ہر مہینے

سائنس پر لیکچر دیا جاتا تھا۔ اور آلات سے تجربے کر کے دکھائے جاتے تھے۔ تاریخ معاشرت، کاشت کاروں کے متعلق بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع کئے گئے۔

۵: ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ میں سرسید نے ایک انجمن برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں۔ اور اس ایسوسی ایشن کے ذریعے سے اپنے تمام مقاصد و مطالب گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔ چنانچہ ریل اور ڈاک خانہ کی بعض آسانیاں حاصل کی گئیں۔

۶: ۱۸۶۷ء میں اور اس کے بعد سرسید کی تحریک سے مختلف اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کی گئیں، جن میں ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل تھے۔

۷: ۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے ایک اخبار علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ جاری کیا، جو آج تک جاری ہے، لیکن اب اس کا نام مسلم یونیورسٹی گزٹ رکھ دیا گیا ہے۔

۸: سرسید نے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز گورنمنٹ کے سامنے پیش کی۔ جس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم مادری زبان میں ہو۔ اسی زبان میں امتحان لئے جائیں۔ اور جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو علم کی مختلف شاخوں میں دی جاتی ہیں، وہی سندیں ان طلباء کو دی جائیں، جو انہیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔ اس یونیورسٹی کے لئے تمام علوم و فنون کی کتابیں اپنی سوسائٹی کی نگرانی میں ترجمہ و تالیف کرانے کا سرسید نے ذمہ لے لیا۔ اور اہتمام شروع کر دیا۔ منجملہ دیگر اہل علم و قلم کے مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب اور پنڈت دھرم نرائن بھی اس خدمت کے لئے آمادہ ہو گئے۔ لیکن یونیورسٹی کی تجویز آگے نہ بڑھ سکی۔ اس لئے کہ سرسید کو گورنمنٹ کا یہ ارادہ معلوم ہوا، کہ وہ کلکتہ یونیورسٹی کو توڑ کر ورنیکولر یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس میں انگریزی بطور اختیاری زبان کے رہے گی۔ اور سرسید یہ نہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی انگریزی زبان سے محروم رہ جائیں۔ اس کے علاوہ اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، کہ سرسید کی مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لئے اردو، اور ہندوؤں کے لئے ہندی زبان ہو۔ آخر سرسید نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔

۹: بنارس میں سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیو پیتھک کے علاج کے طریقے سے بہتر کوئی طریقہ علاج عمدہ اور بے خطر نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے بنارس میں اس علاج کے رواج کے لئے ایک کمیٹی بنائی۔ جس کے صدر مہاراجہ بنارس اور سیکرٹری سرسید تھے۔ اور ایک شفاخانہ بنام ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا گیا۔ اس شفاخانہ کا چرچا چند روز میں نزدیک و دور ہو گیا۔ پہلے مہینے ہی میں پانچ سو سولہ مریض شفاخانہ میں آئے۔ سرسید نے اس علاج کے اصول پر لیکچر بھی دیا، اور ایک رسالہ بھی چھپوا دیا۔

۱۰: ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربر آوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے۔ اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جائے، جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اس کام کے لئے انجمنیں اور سبھائیں بنائیں۔ اور گورنمنٹ کو میموریلم بھیجے۔ سرسید کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ سرسید نے اردو کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اس وقت اردو کے مخالفوں کی تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ ۱۸۸۲ء میں پھر ہندوؤں نے ایجوکیشن کمیشن کو میموریلم بھیجے۔ سرسید نے باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کر دیا کہ یہ مسئلہ تعلیمی نہیں ہے، بلکہ بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے۔ جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ ربط اور علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی۔ ہندوؤں نے لفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں پھر ایک میموریلم اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کے لئے پیش کیا۔

اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج و الم کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش بر دیوار بن گئے تھے۔ مگر اسی حالت میں انہوں نے اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھا، جو ۱۹ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ یہ غالباً ان کی آخری قومی تحریر تھی۔ اس میں بھی ان کی فطری صاف گوئی نمایاں ہے، لکھتے ہیں:

"غالباً اس وقت ان کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر بہادر اس زمانہ میں جبکہ صوبہ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بعوض اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پرانے شدہ مضمون کے اٹھانے کا باعث ہوا ہو، کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے، اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے؟"

اس کے بعد انہوں نے میموریلم کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ اس وقت عدالتوں کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ لیکن سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور زمانہ ریزولیوشن پاس ہوا، جو دونوں قوموں کو سر انٹونی مکڈانل کا عہد حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا۔ یعنی عدالت کی زبان انگریزی قرار دی گئی۔

۱۱: سرسید کا سفر لندن بھی قوم کی خاطر تھا۔ وہاں بھی وہ مسلمانوں کی خدمت سے غافل نہ تھے، جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ ولایت سے آ کر ایک رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جس کا پہلا نمبر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو نکلا۔ اس پرچے کے ذریعے سے اردو صحافت میں، انشا پردازی میں، اخلاق و معاشرت میں، عام معلومات میں اس قدر ترقی اور اتنا اچھا انقلاب پیدا ہوا کہ اس زمانے کے بیسیوں اردو رسائل و اخبارات سے نہ ہو سکا۔ سرسید کے علاوہ اس پرچے میں بہترین اہل قلم مضامین لکھتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے بعض مذہبی مباحث سے مسلمانوں نے اختلاف کیا، جوابات لکھے، سرسید پر کفر کے فتوے لگائے۔ اس رسالہ کے جواب میں رسالے نکالنے شروع کئے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن اس سے اردو زبان و ادب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ تہذیب الاخلاق کی سلیس با اصول پُر زور نثر نگاری نے تمام ملک میں یہی طرز نگارش عام کر دیا۔ تہذیب الاخلاق پہلی بار ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔ دوسری بار ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۱ء تک اور تیسری بار ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۷ء تک۔ سرسید کی وفات کے بعد تہذیب الاخلاق کی جلدوں سے سرسید، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک وغیرہ مضمون نگاروں کے مضامین کے مجموعے مرتب کر دیئے گئے۔ جو ان بزرگوں کی مستقل تصانیف کا درجہ رکھتے ہیں۔

۱۲: سر سید نے تہذیب الاخلاق کے ساتھ ہی ۲۶ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی۔ اس کے مقاصد کا اعلان پہلے سے اشتہار و اخبار کے ذریعے سے کر دیا گیا تھا کہ ———

"انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے سے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں، اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے، اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہئیے۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے، اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے، اور اس کام کے لئے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔"

چنانچہ نواب کلب علی خاں بہادر رئیس رام پور، کنور وزیر علی خان، رئیس دان پور اور سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر صوبہ شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ دی۔ انعامی اشتہار جاری کیا گیا۔ تین انعام پانسو تین سو اور ڈیڑھ سو روپے کے مقرر ہوئے۔ میعاد معین کے اندر ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے موصول ہوئے۔ مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کا مضمون سب سے عمدہ تھا۔ مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ اور پہلا انعام مولوی سید اشرف علی ایم اے کو ملا، جو اس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے۔ دوسرا انعام نواب انتصار جنگ۔ مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) اور تیسرا انعام مولوی عبد الودود کو ملا۔ سر سید نے ان مضامین سے رپورٹ تیار کر کے شائع کی۔ اس رپورٹ میں مجوزہ علی گڑھ کالج کی اسکیم بھی تھی۔ گورنمنٹ ہند اور لوکل حکومتوں نے قیام کالج کی تجویز کو پسند کیا، اور ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ کیا۔

۱۳: مجوزہ مدرسۃ المسلمین کا سرمایہ جمع کرنے کے لئے سر سید نے ایک کمیٹی قائم کی۔ جس میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل نے دس ہزار روپیہ اور سر ولیم میور نے ایک ہزار روپے دیئے۔

۱۴: ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ کی رسم افتتاح ادا کی گئی، اور یکم جون سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی۔ قیام مدرسہ کی تاریخ مولوی صفدر حسین نے خوب کہی ہے۔ قطعہ کا آخری شعر یہ ہے:

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخ مدرسہ
بولا یہ ملہم غیب "اٹھارہ سے چھتر"
۱۸۷۵

۱۵: ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورئینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھا، اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج قائم ہو گیا۔ ۱۸۸۳ء تک ایف اے بی اے اور قانون کے امتحانات کے لئے کلکتہ یونیورسٹی سے اس کالج کا الحاق ہو گیا۔ اس کے بعد سائنس، آرٹس اور قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی سے اس کا تعلق ہو گیا۔ اور آج وہی کالج مسلم یونیورسٹی بنا ہوا ہے۔

۱۶: سر سید ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے دو قانونی مسودے کونسل میں پیش کئے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے کونسل میں پاس ہو گئے۔ اور اس وقت سے آج تک ان کے موافق اکثر علاقوں میں عملدرآمد چلا آتا ہے۔ تیسرا نہایت ضروری و مفید مسودۂ قانون وقف خاندانی یا وقف علی الاولاد کے متعلق تیار کیا تھا، تاکہ ذی مقدور خاندانوں کی اولاد موروثی جائیداد کو فروخت نہ کر سکے، اور وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں نیلام نہ ہو سکے۔ لیکن اس وقت مختلف وجوہ سے سر سید یہ مسودۂ قانون کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ اب قانون وقف علی الاولاد پاس ہو گیا ہے۔

۱۷: اس کے علاوہ سر سید نے قانون، انفصال جائیداد، قانونِ حقوق استفادہ، قانون ترمیم ضابطہ فوجداری، قانون لوکل سیلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسطہ کے کونسل میں پیش ہونے پر جیسی پرزور اور باوقعت تقریریں کیں، ان کو سن کر کونسل کے انگریز ممبر اور خود وائسرائے بھی حیران تھے۔ سر سید برائے نام انگریزی جانتے تھے، اپنے دستخط کر سکتے تھے وائسرائے بھی حیران تھے سر سید برائے نام انگریزی جانتے تھے، اپنے دستخط کر سکتے تھے، اور چند جملے بول سکتے تھے لیکن کونسل میں تقریر کرنے کے لئے وہ اکثر چھوٹی چھوٹی تقریروں کو اول خود اردو میں لکھ کر ان کا انگریزی میں ترجمہ کراتے، اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر خود کونسل میں پڑھتے تھے۔ اور بڑی بڑی تقریروں کو کونسل کا سیکرٹری پڑھ کر سناتا تھا۔ سر سید کی ایک انگریزی تقریر پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی تھی۔ لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا اور تعجب کرتے تھے کہ

"جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا، تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے، اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابل تقریر کبھی نہ سنی تھی۔"

۱۸: ۱۸۸۲ء میں جبکہ سر سید کونسل کے ممبر تھے، ان کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی۔ جس سے ان کا بڑا تجربہ کار ماہر تعلیم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کمیشن کے چند سوالات یہ تھے:

"آیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی کے زیادہ مفید ہو گی؟ کون سی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟ گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم کی تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟ امدادِ تعلیمی یعنی گرانٹ ان ایڈ کا قاعدہ جو مروج ہے، وہ کافی ہے، یا نہیں؟ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے، اور اس میں کامیابی کی کیا توقع ہے؟"

اس طرح کے سب سوالوں کے جواب سر سید نے نہایت دانش مندی، معاملہ فہمی، صداقت اور دلیری کے ساتھ دیئے۔ پھر ۱۸۸۳ء میں گورنر جنرل کی کونسل میں سی پی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پیش ہوا۔ اس میں سادہ و عام انتخابات کی تجویز کی گئی تھی۔ یعنی تمام صوبہ کا مشترکہ و مخلوط انتخاب کیا جائے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جس قوم کی آبادی زیادہ ہو گی، اس کے ممبر زیادہ چنے جائیں گے۔ سی پی یعنی صوبہ جات متوسط میں ہندوؤں کی تعداد نہایت کثرت سے تھی، تو ممکن تھا کہ مسلمان ممبر ایک بھی منتخب نہ ہو، یا پھر اتنے کم ہوں کہ لوکل بورڈ اور کمیٹی میں ان کی کوئی آواز نہ سنی جائے۔ اس بنا پر سر سید نے اس بل کی نہایت سختی سے مخالفت کی۔ سر سید اس سے پندرہ برس پہلے ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں کی ہمدردی اور تعاون عمل سے مایوس ہو چکے تھے۔ سر سید نے گورنر جنرل کی کونسل میں پرجوش تقریر کی، اور تفصیلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ہندوستان میں سب قوموں کا یکجائی و بلا امتیاز انتخاب جاری کرنا نہایت خطرناک ہو گا۔

۱۹: ۱۸۸۳ء میں سر سید نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کیا۔ تاکہ اس کے چندے سے مسلمان لڑکوں کو انگلستان بھیجا جائے۔ اور سول سروس کے امتحان مقابلہ یا ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری یا بیرسٹری، ڈاکٹری، انجینیری کا ڈپلوما حاصل کرنے میں اس کی امداد کی جائے۔

۲۰: ۱۸۸۶ء میں سر سید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ یہ ہندوستان میں سب سے بڑی تعلیمی انجمن تھی۔ سر سید کی زندگی میں اس کے گیارہ اجلاس ہوئے۔ اتنے ہی عرصے میں اس کانفرنس کے ذریعے سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو گئی۔ بے شمار انجمنیں، مکاتب، اسکول قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔ تعلیمی مردم شماریاں ہوئیں۔ غیر سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ طالب علموں کو وظائف دیئے گئے۔ اسی طرح سے مسلمانوں کی اصلاح حال اور ترقی تعلیم کا ہر ممکن وسیلہ

اختیار کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ کانفرنس جس کا مرکز علی گڑھ تھا، ختم ہو گئی۔ اور کراچی میں اس نے پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے دوبارہ کام شروع کیا۔

کانگریس کی مخالفت

انڈین نیشنل کانگریس ایجوکیشنل کانفرنس سے ایک برس پہلے معرض وجود میں آئی تھی۔ پہلے اس کا مقصد یہ مشتہر کیا گیا تھا کہ سرکار نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستان والوں سے وعدہ کر رکھا ہے، اس کا مطالبہ کیا جائے۔ سرسید نے دو برس تک انڈین نیشنل کانگریس کی رفتار کار کا جائزہ لیا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو مظاہرہ پرستوں سے پاک رکھیں۔ ۱۸۸۷ء میں کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہوا اس وقت لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف ایک پُر زور اور مدلل تقریر کی۔ بعد ازاں ۱۸۸۸ء میں میرٹھ میں دوسری تقریر کی، اور پھر مضامین، تقریروں اور زبانی گفتگو کے ذریعے کانگریس کا پول کھول کر رکھ دیا۔

ان تدابیر سے سرکار ہند کو یقین دلا دیا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص طور پر مسلمان شریک نہیں ہیں۔ چنانچہ سرسید اپنے ایک خط میں بدرالدین طیب جی کو لکھتے ہیں:

"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے۔ بیچ میں کود پڑے ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے، ویسے ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے

سرسید کی تصانیف

سرسید کی علمی اور ادبی زندگی کا آغاز سید الاخبار سے ہوا۔ یہ اخبار ۱۸۳۵ء میں سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خان نے دہلی سے جاری کیا تھا۔

۱: جام جم (فارسی) اس کتاب میں امیر تیمور سے بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا مختصر حال لکھا ہے۔ اس کتاب کا زمانہ سرسید کی ملازمت آگرہ کا زمانہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۴۰ء میں چھپی تھی۔

۲: جلاء القلوب بذکر المحبوبؐ۔ یہ تالیف مولود شریف کی محافل میں پڑھنے کے لئے ہے۔ ۱۸۴۲ء میں چھپی۔

۳: تحفۂ حسن۔ یہ تالیف اور ترجمہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی تصنیف، تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دسویں اور گیارہویں کا۔ یہ رد شیعت میں لکھا گیا۔ اس کے بعد سرسید نے شیعہ عقائد سے کبھی تعرض نہ کیا۔

۴: تسہیل فی جر الثقیل۔ ۱۸۴۴ء میں چھپی۔ یہ کتاب ابوذر یمنی نے عربی میں لکھی تھی۔ بو علی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سرسید نے بو علی کے فارسی ترجمے سے اس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں جر ثقیل کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔

۵: آثار الصنادید۔ یہ کتاب سرسید کی یادگار کتابوں میں سرفہرست ہے۔ اس کتاب میں دہلی کی پرانی اور تاریخی عمارات کا حال درج ہے۔ علاوہ ازیں اس میں بے شمار مشائخ، علماء، اطبا، فقراء، مجذوبین، قراء، شعراء، خوش نویس اور موسیقی دان حضرات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ دہلی کے تقریباً سبھی قابل ذکر محلوں، پرانی مسجدوں، بازاروں، مندروں، باولیوں اور کنوؤں کا تفصیل سے تاریخی حوالوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں، ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا، اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا، تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے، اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا:

آثار الصنادید سرسید نے ڈیڑھ برس کی قلیل مدت میں لکھ کر تیار کر لی۔ اور ۱۸۴۷ء میں چھپ گئی۔ اس کی عبارت مولوی امام بخش صہبائی نے لکھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپا۔ غدر میں اس کتاب کی تقریباً سبھی کاپیاں ضائع ہو گئیں۔ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی نہ ہو سکا۔ ہاں ازاں بعد مشہور مستشرق گارسان دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا۔ اس فرانسیسی ترجمے کی وجہ سے لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی کا انگریزی فیلو مقرر کیا۔

آثار الصنادید کا تیسرا اور چوتھا ایڈیشن مطبع نول کشور نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ جس کے نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ پانچواں ایڈیشن نامی پریس کانپور سے چھپا۔ لیکن اس ایڈیشن میں وہ باب حذف کر دیا گیا، جس میں سرسید نے دہلی کے مشاہیر کے احوال لکھے تھے۔

۶: کلمۃ الحق۔ یہ رسالہ سرسید نے ۱۸۴۹ء میں تالیف کیا۔ اس میں پیری، مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقہ کے خلاف لکھا گیا۔

۷: راہ سنت در رد بدعت۔ سرسید نے یہ رسالہ اہل بدعت کے خلاف اہل سنت کی تائید میں لکھا۔

۸: سلسلۃ الملوک۔ اس میں ہندوستان کے ان راجہ، مہاراجوں اور بادشاہوں کی فہرست ہے، جو دہلی پر پانچ ہزار برس سے حکومت کرتے چلے آئے تھے۔ یعنی اس کتاب میں راجہ یدھشٹر سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک کے بادشاہوں کا مجمل ذکر کیا گیا ہے۔

۹: قول متین در ابطال حرکت زمین۔ سرسید شروع شروع میں زمین کی سورج کے گرد گردش کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ یہ رسالہ اس نظریے کی حمایت میں لکھا۔ مگر بعد میں وہ اپنے نظریئے کے خلاف ہو گئے تھے۔

۱۰: فوائد الافکار فی اعمال الفرجار۔ سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ فرید الدین نے فارسی میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ سرسید نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۴۹ء میں ختم ہوا۔

۱۱: سیرت فریدیہ۔ یہ کتاب سرسید کے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کے زندگی کے حالات پر مشتمل ہے۔

۱۲: تاریخ ضلع بجنور۔ سرسید جس زمانے میں بجنور کے صدر امین ہو کر گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے ضلع بجنور کی ایک مکمل تاریخ مرتب کی۔ افسوس کہ یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔ اس کا مسودہ کلکٹر کے پاس گیا۔ اس نے سرکار ہند کو بھجوا دیا۔ مگر افسوس کہ غدر کے طوفان کی نذر ہو گیا۔

۱۳: تصحیح آئین اکبری۔ اس کتاب کا مصنف شہنشاہ اکبر کا وزیر خاص ابوالفضل تھا۔ اس کی زبان فارسی تھی، اور اس میں بادشاہ اکبر کے اصول و طرائق سلطنت درج تھے۔ کتاب کا نام آئین اکبری تھا۔ اس کی زبان ایسی فارسی تھی، جس میں عربی کے الفاظ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اور اس کا اسلوب بھی بے حد دقیق تھا۔ کاتبوں کی بے پروائی سے اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ حاجی قطب الدین تاجر کتب نے سرسید سے گذارش کی کہ وہ اس کتاب کی تصحیح کر دیں، سرسید نے اس کی تصحیح کی۔ مگر یہ کتاب بھی غدر کے ہنگاموں میں تلف ہو گئی۔

۱۴: تاریخ سرکشی ضلع بجنور۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک کے غدر کے حالات اس کتاب میں پوری تفصیل سے لکھے ہیں۔ کیونکہ سرسید اس زمانے میں

بجنور میں تھے۔ غدر کی انہوں نے ایک پوری ڈائری لکھ رکھی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کو لکھتے وقت اس ڈائری سے مدد لی گئی۔

۱۵: رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ یہ رسالہ ۱۸۵۸ء میں چھپوایا گیا۔ ہنگامہ غدر کے بعد حکومت مسلمانوں کی دشمن ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسے ہندوؤں نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ غدر میں سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان مسلمانوں کا ہوا، اور ان پر ہی تباہی و بربادی نازل ہوئی۔ چنانچہ سرسید نے اسباب بغاوت ہند لکھی، اور یہ ثابت کیا کہ غدر اصل میں حکومت کی خامیوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ تھا۔ سرسید نے پوری تفصیل کے ساتھ لکھا کہ مسلمانوں میں بھی جہاد کی کوئی سازش نہ تھی، بلکہ بہت سی باتیں برسوں سے جمع ہو رہی تھیں، جن سے ہندوستانیوں کا دل سرکار انگریزی سے پھٹتا جا رہا تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انتظام حکومت قانون سازی اور مشورہ و تدبیر میں اہل ہند کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو کوئی دخل نہ تھا۔ اور حاکم و رعایا کے درمیان تبادلۂ خیالات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ سرکار کے احکام و قوانین کی مصلحت کو اہل ہند نہ سمجھ سکتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس سمجھ لیتے تھے۔ اور ان کو سمجھانے کا کوئی وسیلہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ غدر کی معلومات کے متعلق سرسید کا یہ رسالہ آج بھی ہمیں بہت سے حقائق سے روشناس کراتا ہے۔ یہ کتاب ولایت پہنچی، تو وہاں کچھ سرسید کی حمایت میں ہو گئے۔ اور بعض ارکان حکومت نے سرسید کو غدار قرار دیا کہ اس نے یہ کتاب لکھ کر حکومت کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ سرسید نے یہ کتاب چھپوائی نہیں، بلکہ کسی کو دکھائی تک نہیں، تو وہ اس کی وفاداری کے قائل ہو گئے۔

۱۶: ہندوستان کے وفادار مسلمان۔ سرسید نے یہ سلسلۂ مضامین غدر کے بعد مسلمانوں کو غدر کے اسباب سے بری الذمہ ثابت کرنے کے لئے شروع کیا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ ۱۸۶۱ء میں یہ سلسلہ تین نمبروں کے بعد بند ہو گیا۔

۱۷: تحقیق لفظ نصاریٰ۔ غدر کے بعد گورنمنٹ نے بعض مسلمانوں کی ایسی تحریریں حاصل کر لی تھیں، جن میں انگریزوں کو نصاریٰ لکھا گیا تھا۔ انگریزوں نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ جس طرح یہودی حقارت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو ناصری کہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان انہیں نصاریٰ کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے انگریزوں نے بعض مسلمانوں کو سخت سزائیں بھی دیں۔ اس پر سرسید نے ایک مختصر رسالہ لکھا جس میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق کی گئی۔ اور لکھا کہ یہ لفظ ناصری سے نہیں، بلکہ نصر سے مشتق ہے قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناصری نہیں کہا گیا۔ نہ قریہ ناصرہ کا کہیں ذکر ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت کے بعد کسی مسلمان سے باز پرس نہیں کی گئی۔ جبکہ کانپور میں ایک مسلمان کو پھانسی دی جا چکی تھی۔

۱۸: تصحیح تاریخ فیروز شاہی۔ مراد آباد میں سرسید نے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی۔

۱۹: تبیین الکلام۔ یہ کتاب توریت اور انجیل کی تفسیر ہے۔ سرسید نے یہ کتاب بے حد محنت و تحقیق کے بعد لکھی۔ اس کا مقصد اس زمانے کے مشنریوں کو دلائل سے مسکت جواب دینا تھا۔ یہ کتاب غازی پور میں ۱۸۶۲ء میں چھپی تھی۔

۲۰: سفر نامہ لندن۔ یہ سرسید کا سفر نامہ ہے۔ انہوں نے لندن میں اپنے قیام اور وہاں سے روانگی تک کے دلچسپ حالات درج کئے ہیں۔

۲۱: خطبات احمدیہ۔ اس کتاب کے بارے میں حالی لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا۔ ان کی منادیوں میں، اخباروں اور رسالوں میں زیادہ تر لوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی برائیاں اور بانیٔ اسلام پر نکتہ چینیاں ان کی تقریر و تحریر کا موضوع تھیں۔ اور بعض جاہل و مفلس مسلمان ان کے دام میں آ جاتے تھے۔ دوسرے مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگریز قوم نے ہندوستان سے لی تھی، ہمیشہ حکمران قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے۔ اور انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔ تیسرے مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم و فنون کی طرف سے خطرہ تھا، جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتے جا رہے تھے، اور جن سے اہل ہند کو کسی طرح مفر نہ تھا۔ یہاں تک کہ خود سرسید کو یہ تعلیم پھیلانی پڑی۔ اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے عقائد و اعمال اور اصول و قوانین کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو۔ سرسید نے "خطبات احمدیہ" لکھ کر خالص اسلامی خدمت کی۔

اس کتاب پر سرسید نے بڑی محنت کی، اور بڑی مالی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ ولایت میں بیٹھ کر انہوں نے عیسائیت کے پرچار کرنے والوں کو اسلام کی صحیح اور حقیقی تصویر دکھائی۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ ـــــ

"ولیم میور کی کتاب دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل جلا دیا۔ اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت پاک پر جیسا کہ ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے، اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں، تو بلا سے ـــ لکھنے میں شب و روز معروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا، ملنا جلنا سب بند ہے۔ کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے۔ سود اور روپیہ میں ادا کر دوں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے، اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف تک فروخت کر کے ہزاروں روپیہ بھیج دو۔ کیا کہئے، اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے ..... لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔"

جب روپیہ لندن پہنچ گیا، اور کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو گئی، تو سرسید بے حد خوش ہوئے۔ چنانچہ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

"میرا لندن آنا دس حج کے برابر سمجھو۔ سر ولیم میور اور دوسرے مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے، سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں۔ اور یہ شرط ہے، کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو۔ وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہنے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے، تو میرا نام ہے، ورنہ میرا نام نہیں ـــ"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم نے پڑھی، جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے، جو الفاظ کہ اس نے کہے، اور مجھے لکھے، اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں۔"

انگریزوں نے اس کتاب کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ چنانچہ ڈیوینٹی کالج لاہور کے پرنسپل ریورنڈ ہوپر لکھتے ہیں:

"مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خان کو کافر سمجھا اور بدمذہب

سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے، وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خان سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔“

پریچنگ آف اسلام کے مصنف مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں:

”ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی، اور اس کا ترجمہ کسی یوروپ کی زبان میں ہو گیا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یوروپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔“

لندن کے ایک روزنامے میں کسی انگریز نے لکھا:

”عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے، کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انہیں کے ملک کے اندر بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان کے تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے، جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں ــــ“

لندن ہی میں ایک عیسائی جان ڈیون پورٹ نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں ایک کتاب ”اپالوجی فار محمدؐ اینڈ قرآن“ لکھی۔ سرسید نے اس کے مضامین سنے، اور بہت پسند کئے۔ مصنف کو اتنی استطاعت نہ تھی کہ اپنے خرچ پر چھپاتا۔ لندن کا کوئی عیسائی پبلشر اسے چھاپنے پر تیار بھی نہیں تھا۔ سرسید نے فوراً روپوں کا انتظام کر کے اس کتاب کو وہیں لندن میں شائع کرا دیا۔ ہندوستان میں اس کا ترجمہ مولوی عنایت الرحمان دہلوی نے کیا۔

انگلستان میں ایک انگریز مصنف نے کسی زمانے میں اسلام کی تائید میں ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب نایاب ہو گئی تھی۔ سرسید نے لندن میں ایک جرمن کتب فروش کی دکان سے کئی گنا قیمت دے کر اسے خریدا، اور ہندوستان میں آ کر پانچ سو روپے خرچ کر کے اس کا اردو میں ترجمہ کرایا، اور پھر حمایت الاسلام کے نام سے اسے چھپوایا۔

رسالہ ابطال غلامی

یہ مضمون اپنی جگہ پر خطبات احمدیہ کا ایک حصہ تھا۔ سرسید نے اسی عنوان پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر سب سے پہلے تہذیب الاخلاق میں شائع کیا۔ اور پھر الگ کتابی شکل میں بھی چھپوا دیا۔ یوروپ اور امریکہ میں کسی زمانے میں غلامی عام تھی، اور وہاں غلاموں کی عام خرید و فروخت ہوتی تھی، لیکن انیسویں صدی میں اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب عیسائی مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے، کہ ان کے مذہب نے غلام لونڈی خریدنا جائز قرار دیا ہے۔ سرسید نے بڑے مدلل انداز میں ثابت کیا کہ اسلام نے شروع شروع میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کو آزاد کر دینے کی ترغیب دی۔ اور پھر اس رسم کو بالکل ممنوع کر دیا۔

تفسیر القرآن

یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس میں تمام معجزات، اور خلاف عادت اور غیب کی باتوں سے انکار کرنا، ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنا۔ جنوں سے صحرائی اقوام مراد لینا، وغیرہ وغیرہ اصلاحی نظر سے غیر ضروری تھا۔ اور اسلامی نگاہ میں غلط فہمی پر مبنی۔ اس کے بارے میں حالی بیان فرماتے ہیں:

”آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا وثوق کہ ان کو اپنی برائیوں پر تھا، حد اعتدال سے تجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے، جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا، کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزوریوں اور بودی تاویلوں کو صحیح لکھتا ہے۔“

سفرنامہ پنجاب۔ ۱۸۸۴ء میں سرسید نے پنجاب کا دورہ کیا۔ پنجاب میں سرسید نے جو تقریریں کیں، اور لیکچر دیئے۔ وہ اس کتاب میں درج ہیں۔

جواب امہات المومنین۔ ایک اعتبار سے یہ سرسید کی آخری تصنیف ہے۔ ایک عیسائی نے حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے تعدد ازدواج پر اعتراض کیا، اور امہات المومنین کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ سرسید نے بیماری کی حالت میں اس کا مدلل جواب لکھا۔

مضامین تہذیب الاخلاق

سرسید کا یہ رسالہ گیارہ بارہ برس تک جاری رہا۔ اس رسالے میں دوسرے اکابرین بھی لکھتے تھے، لیکن سب سے زیادہ مضامین اس میں سرسید نے لکھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد یہ مضامین ایک کتابی صورت میں طبع ہوئے، اور مضامین تہذیب الاخلاق کہلائے۔

خطوط سرسید

غالب کے بعد یہ رتبہ خطوط کے سلسلے میں سرسید کو ہی ملا کہ وہ زبان و ادب کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ علمی اعتبار سے بھی وہ نمونہ ہیں، اور اس عہد کی مکمل سیاسی، معاشرتی اور سوشل تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔

سرسید کی نثر نگاری

سرسید کے اسلوب تحریر کو ہم قدیم اسلوب تحریر کہہ سکتے ہیں۔ اٹھارہ برس کی عمر میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی سید محمد خان کے اخبار ”سید الاخبار“ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ مولانا حالی سرسید کی تحریر کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

”سرسید تحریر یا تقریر کی رو میں گرامر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ وہ ان پابندیوں اور قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں، بالکل آزاد تھے۔“

اگر ہم سرسید کے عہد پر ایک نظر ڈالیں، تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس زمانے میں زبان کے قاعدوں کی اتنی زیادہ پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ اور وہ جملے بڑے بے ترتیب سے ہوتے تھے۔ نمونہ از ”اسباب بغاوت ہند“:

”لیجس لیٹیو کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین و ضوابط کی جو جاری ہوئے، بخوبی معلوم نہیں ہو سکی، اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کو واجبات سے تھا، ملحوظ نہیں رہیں، اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی۔ بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی، ہندوستانیوں کو بہ سبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے، اور اس تجویز سے واقف نہ تھے، اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی، اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔ اور وہ بعضی باتیں جو در حقیقت گورنمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں، قطع نظر اس کے کہ وہ فی نفسہ اچھی تھیں یا بری، زیادہ تر ان کے غلط خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایائے ہندوستان ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی۔ اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی۔ اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج ان کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں، تو کل نہیں۔ اور کل ہیں تو پرسوں نہیں۔

اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔ جبکہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو، جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ تو پھر کیا توقع ہو سکتی ہے، وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے، اور جبکہ ہماری گورنمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی، تو ان غلط خیالات کا ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج کہ ان کے دل پر تھا، اس کا علاج نہ ہونا، صرف اس سبب سے تھا کہ لجس لیٹیف کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے اگر ہوتے تو سب باتیں رفع ہو جاتیں۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے، تو صرف یہی ایک بات ہے، جس نے اپنی بہت شاخیں پیدا کر کے تمام ہندوستان میں بیجا فساد کر دیا۔"

نمونۂ نثر۔ آثار الصنادید:

"اسی مکان کے بیچوں بیچ میں مشہور دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا تخت ہے۔ چار گز کا مربع اور اس پر چار ستون لگا کر بنگلے کے طور پر اس کی چھت بنائی ہے۔ اور آدمی کے قد سے زائد کرسی دی ہے۔ اس کے پیچھے ایک طاق ہے سنگِ مرمر کا بنا ہوا، سات گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا۔ اس پر ہر ہر قسم کے چرند پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اس میں ایک آدمی کی تصویر ہے، جو وہ تارا بجا کر گا رہا ہے۔ ملک اٹلی میں جو فرنگستان میں واقع ہے۔ آرفیوس کلاونت کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا، تو چرند پرند اس کی آواز سن کر مست ہو جاتے تھے، اور اس کے گرد آ بیٹھتے تھے۔ اسی ملک میں رفیل نام ایک مصور تھا کہ تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔ اس مصور نے آرفیوس کے گانے کی جو کہانی مشہور تھی، اس کے مطابق اپنے خیال سے ایک مرقع کھینچا تھا، اور چرند پرند اس کے گرد گانا سننے کو بیٹھے ہوئے بنائے تھے۔ یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مر گیا، مگر یہ مرقع اس کا بنایا ہوا ملک اٹلی اور ولایت فرنگستان میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے۔ اور اب اس کی نقلیں موجود ہیں۔ وہی مرقع اس طاق میں پتھر کی پچکاری میں کھودا ہے۔ بس یہ تصویر اسی آرفیوس کی ہے، اور جو کہ اس مرقع کا سوائے فرنگستان کے اور کہیں رواج نہ تھا۔ اس سبب سے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی انگریز اٹلی کے ملک کا شریک تھا۔ اس محراب کی بغل میں دروازہ ہے، اور اندر سے بھی آنے کا راستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ امرا میں سے جس کسی کو عرض کرنا ہوتا تھا، اس تخت پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا یہ تخت اتنا اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا گلا تخت تک پہنچتا ہے۔"

از۔ نشیمن ظل الٰہی یا سنگین تخت۔

سرسید کی نثر کے بارے میں جناب حامد حسن قادری تحریر فرماتے ہیں:

"غدر کے بعد جب سرسید نے اپنا مقصد حیات، مسلکِ زندگی اور لائحہ عمل متعین کر لیا۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے قومی و ملکی، مذہبی و معاشرتی اصلاحی، اخلاقی علمی و تعلیمی خدمات شروع کیں۔ اس وقت سے ان کے فکر و قلم اور زبان و بیان کا اصلی جوہر اور حقیقی کمال نمایاں ہوا۔ ان سے پہلے کسی ایک شخص کے زبان و قلم سے اس قدر گوناگوں مضامین ادا نہ ہوئے تھے۔ سرسید کی مختلف موضوعات کی کتابیں، اخبار اور رسالے کے مضامین، پبلک تقریریں اور پرائیویٹ خطوط شاہد ہیں کہ ہر نوع کی بہتر سے بہتر تحریر کی بنیاد ڈالنے والے سب سے پہلے سرسید ہیں۔

سرسید کی تحریر میں زبان و محاورہ کی لطافت، بیان کی سادگی و صفائی، استعارہ و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال و بے ساختگی، بیان کا جوش، طرز ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت و ظرافت اس قدر کثرت، صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان سے پہلے کہیں نہ تھی۔ ان کے ساتھیوں میں ان سے بہتر نہ تھی، اور ان کے ہم زمانہ لوگوں میں اکثر انہی کے اتباع کے بدولت تھی۔ سرسید پیچیدہ سیاسی مسائل باریک مذہبی نکات اور دشوار اصلاحی مباحث کو نہایت صفائی، سادگی، بے تکلفی اور زور و قوت کے ساتھ بیان کر سکتے تھے۔ ان کی برجستہ تقریروں اور قلم برداشتہ تحریروں میں بھی وہی انداز پیدا ہے، جو غور و فکر سے لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین میں ہے۔ حسب موقع اسلوب بیان اختیار کرنا، شوخی و سنجیدگی سے برمحل کام لینا، جذب و اثر پیدا کرنا ان کے لئے بالکل فطری اور طبعی بات تھی۔ کسی خاص کوشش اور ارادہ کو دخل نہ تھا۔ گویا ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی، اور صحیح انداز خود بخود پیدا ہو جاتا تھا۔ جن الفاظ و محاورات کو بولنے کی ان کو عادت تھی، بے تکلف استعمال کر دیتے تھے یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اہل زبان یا اہل دہلی کیا اور کس طرح بولتے ہیں۔ دقیق علمی، فلسفیانہ سائنٹفک، تنقیدی مضامین اس قدر سمجھا کر بیان کرتے تھے، کہ اس فن میں گویا ان کو اولیت حاصل تھی۔ ..... مزاح اور ظرافت سرسید کا فطری رنگ تھا۔ لیکن یہ موقع اور محل پر صرف ہوتا تھا۔"

نمونہ نثر از۔ تبیین الکلام (تفسیر توراۃ و انجیل)

"اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک لفظ یا ایک فقرہ کئی معنی رکھتا ہے، اور اس کے مقابلے میں دوسری زبان کا ایسا لفظ نہیں ہوتا، جس سے وہ سب معنی حاصل ہوں، اس لئے بہ مجبوری یا تو اس کا ترجمہ کسی ایک پہلو پر کرتا ہے۔ یا صرف بموجب اپنی رائے اور اپنے اعتقاد اور اپنے مسلمات کے اس کا ترجمہ کر دیتا ہے۔ جو درحقیقت کلام الٰہی کی وسعت کو ناواجب تنگی میں ڈالتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ جب تک، بذریعہ الہام کے کوئی خاص معنی کسی کلام الٰہی کے مقرر نہ ہو گئے ہوں۔ اس وقت کلام الٰہی سے جس قدر مطالب ہوں، ان سب کو سمجھے، اور سب پر غور کرے۔ اور جو مطلب حق اور صحیح ثابت ہو، اس کو اختیار کرے۔ پس جبکہ مترجم نے اس کلام الٰہی کو جس میں متعدد پہلو تھے ایک پہلو پر جو اس کے اعتقاد کے مطابق تھا، ترجمہ کر دیا، تو اس نے ایک عام حق تلفی کی خصوصاً اس صورت میں جبکہ اس کا اعتقاد جس کے بموجب اس نے ترجمہ کیا، درحقیقت غلط ہو۔ ان وجوہات سے ہم مسلمانوں کے پاس ضرور تر ہے کہ جس زبان میں مذہب کی اصلی کتابیں ہوں، اس زبان سے واقف ہونا چاہیئے۔ اور جب تک اصلی زبان سے واقفیت نہ ہو، صرف ترجمہ پر اعتقادیات میں اعتماد نہیں ہو سکتا۔ دیکھو کیسی غلطی کی، کتنے بڑے ترجموں کی، نہ تصدیق کرنی چاہیئے، نہ تکذیب کرنی چاہیئے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے، اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔"

نمونہ از: خطبات احمدیہ:

"اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعداد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے۔ اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک نہایت خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا خدا کی مرضی کے موافق ہو، جس نے مرد عورت کو جوڑا پیدا کیا۔ ضرور ایسا ہو گا جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہ ہو، اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اور یہی مسئلہ ٹھیٹھ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس

نازک معاملہ اور دقیق اور پرپیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے، جہاں فرمایا ہے، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیئے) اس آیت کے اگر وہی ظاہری معنی لئے جائیں، جیسے کہ اکثر فقہا اور علماء نے لئے ہیں، تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے۔ کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا، وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازدواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔"

نمونہ از: **تفسیر القرآن**۔ بہ سلسلہ غزوات آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

"تمام انبیاء جبکہ قوم کی اصلاح اور ان کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں، تو ابتداء میں عموماً ان کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں، اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے، تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا۔ اگر بعد حضرت مسیحؑ کے اس کے لئے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اس کے پیروؤں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی، اور بزور حکومت اس کو ترقی دی گئی پس یہ کہنا کہ انبیاء کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں، یہ ایک ایسا قول ہے، جس کو قانون قدرت مردود ٹھہراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰؑ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں، اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیحؑ کو پیش کرتے ہیں مگر حضرت مسیحؑ نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا، اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا، اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) ان پر ایمان لائے تھے۔ ان کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں، حاصل نہ ہوئی تھی۔ اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ یعنی مصلوب ہونا واقع ہوا۔ اس کے بعد اگر اس کے ایسے حامی پیدا نہ ہو جاتے، جو دشمنوں کو دفع کر سکے، تو آج دنیا میں ایک گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔"

نمونہ نثر از مضامین **تہذیب الاخلاق**۔ دیباچہ رسالہ تہذیب الاخلاق:

"اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے۔ تاکہ جس حقارت سے مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں، وہ رفع ہو جائے۔ اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلاویں۔ سویلزیشن انگریزی لفظ ہے، جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے، مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے، انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے، اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے، اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"

نمونہ ثانی از مضامین **تہذیب الاخلاق**:

"الحمد للہ کہ سنہ ۹۰ء پورا ہوا، اور سنہ ۹۱ء اکانوے شروع ہوگیا۔ ہمارے اس پرچہ کو جاری ہوئے سوا تین برس ہوگئے۔ پچھلا سال بھی خندۂ گل و نالۂ بلبل سے خالی نہیں گیا۔ ہمارے ہم دنالہ نے بدستور غلغلہ رکھا۔ اور ہمارے ناصحانِ شفیق کا بھی شور و شغب کم نہ ہوا ؎

حسن شہرت، عشق رسوائی تقاضا می کند
جرم معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست

ناصحان شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا، اور کبھی کچھ، آخر کار ہم کو کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا۔ دور و نزدیک کے مولوی صاحبان سے کفر کے فتووں پر مہریں چھپوا ہی منگوائیں، اور ہمارے اوپر، ہمارے ناصح شفیق جناب مولوی حاجی سید امداد العلی صاحب نے ایک رسالہ چھاپ ہی دیا، اور امداد الآفاق اس کا نام رکھا۔ بھلا اور کچھ ہوا یا نہ ہوا۔ بے چارے غریب چھاپہ والے کو تو فائدہ ہو گیا۔ اسی سال میں ہماری تحریرات کی تردید میں مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر نے جو امید ہے، کہ اب تک حاجی ہو گئے ہوں گے، اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ سے ان کو بھی حاجی لکھا کریں گے) دو رسالے تحریر فرمائے جن میں سے ایک کا نام شہاب ثاقب اور دوسرے کا نام تائید الاسلام۔ اخباروں میں نور الانوار اپنا نور عالم میں برساتا ہی تھا۔ مگر اس سے ایک اور پرچہ ان کے گھر کا اجالا المسمّٰی بہ "نور الآفاق لامع ظلمۃ النفاق" پیدا ہوا ہے، جو نہایت ہی دلچسپ ہے اور ہمارے اس پرچہ تہذیب الاخلاق کے جواب میں لکھا ہے۔ اس کے مضامین ظاہرا تو جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں، مگر بعض لوگ ان مضامین کو لے پالک بتاتے ہیں۔ بہرحال ہم کو اس سے کیا کہ وہ میاں نذیر کے ہیں، یا میاں بشیر کے۔ کسی کے ہوں، مگر دلچسپ ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔"

نمونہ از مضمون۔ **"دافع البہتان"**:

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا۔ تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں؟ ظاہرا اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے، قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں، جتنے گناہ کرنے ہیں، سب کر لیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہو جاویں گے۔ جیسے کہ بعض آدمی مسہل لینا چاہتے ہیں، تو خوب بد پرہیزی کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیئے، کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں، اور شبلی اور جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں، مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں، نہ کسی بشارت سے، آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں، جب تک میں ہی نہ معاف کروں، معاف نہیں ہو سکتے۔ پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج در احمد کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہیے، ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

نمونہ از مضمون **"آزادی رائے"**:

اگرچہ رسم و رواج بھی اس کے برخلاف رایوں کے اظہار کے لئے ایک بہت قوی مزاحم کار گنا جاتا ہے: لیکن مذہبی خیالات مخالفِ مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت ہی قوی مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے، کہ اس مخالف رائے کا اظہار ہونا ان کو ناپسند ہے، بلکہ اسی کے ساتھ جوش مذہبی اشتد آتا ہے، اور عقل کو سلیم نہیں رکھتا، اور اس حالت میں ان سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں، جو انہیں کے مذہب کو جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پہنچاتے ہیں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بہ سبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے انہیں کے مذہب کے لوگ ان کے حال پر متوجہ نہ ہوں،

اور مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کئے، اور بلا رفع کئے باقی رہ جاویں وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں، کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں، مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے۔ اگر انہی کے مذہب کا کوئی شخص بہ غرض حصول اغراض مذکورہ ان کو پھیلانا چاہے، تو اس کو خود معترض کی جگہ تصور کرتے ہیں، اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔

اقتباس از مضمون، امید کی خوشی:

”اے نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی اُمید! یہ سدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے، تو ہی ہمارے اڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری بدولت ہی نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے، نام آوری نام آوری کے لئے، بہادری بہادری کے لئے، فیاضی فیاضی کے لئے، محبت محبت کے لئے، نیکی نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع، اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا گناہگار انسان، جبکہ شیطان کے چنگل میں پھنسا، اور تمام بدیوں نے اسے گھیرا، تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی، تو نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا۔ تو نے ہی اس کو ذلت سے نکالا، اور پھر اس کو اعلیٰ درجہ پر پہنچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔ وہ پہلا ناخدا، جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا۔ اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی، اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے، ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں، جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں۔ اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجب قسم کا خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے، اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بے دردی سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے، اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں۔ اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے، اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں بھرا ہوا زمین پر پڑا دیکھتا ہے، تو اے بہادروں کی قوت بازو، اور اے بہادری کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارہ میں سے تیرے نغمہ کی آواز سنتا ہے۔

وہ قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کا فکر کرتا ہے، دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے، انہیں کو دشمن پاتا ہے۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں، عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں، بھائی بند عزیز و اقارب سب سمجھاتے ہیں، اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو جاتے ہیں:۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں، مگر ہاں ہاں کر کر، محنت اور دلسوزی سے دور رہ کر بہت سے ہمدردی کرتے ہیں، پر کوشش کرنے سے الگ کر کر، اے بے قرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت، تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی (نواب محسن الملک) کی پیاری ”امید“ تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے، اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منہ پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہونٹوں، اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے، اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا! جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچتی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے ایمان کے توشہ اور نیکی کے ہادی۔ اور موت کی سواری سے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے، وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام امید ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے، اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے، وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانے کی امید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے:

بقدر پُر سکون راحت بود، بنگر تفاوت را
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مُردن

نمونہ نثر- بہ طرز مکالمہ

اردو زبان میں اس اسلوب کو غالب نے رائج کیا تھا۔ یعنی خطوں میں مکالمے کے انداز میں گفتگو کرنا۔ سرسید کے اخبار تہذیب الاخلاق سے پہلے مولوی نذیر احمد کی کتاب ”مراۃ العروس“ چھپ کر سامنے آچکی تھی۔ اور اس میں اسی طرز نگارش یعنی مکالمہ طرازی سے کرداروں کی زبان سے کہانی بیان کی گئی تھی۔ اور علاوہ ازیں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی ”اودھ پنچ“ اخبار میں اپنا فسانہ آزاد قسط وار دینا شروع کر دیا تھا۔ ان تمام حضرات کے انداز نگارش سے سرسید بے خبر نہیں تھے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ غالب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ مثلاً یہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

”ہیں؟ تم نے یہ کیسی متضاد باتیں کیں؟“

”حضرت میں کیا کروں؟ انسان کی جبلت ہی ایسی متضاد باتوں پر واقع ہوئی ہے۔“

”اس متضاد جبلت کے سبب بڑے بڑے بزرگوں، یہاں تک کہ انبیاء کو بھی نہایت مشکلیں پیش آئی ہیں۔ مذہب سی عمدہ چیز کا بھی اسی جبلت نے ستیاناس کر دیا۔“

”حضرت اب تک تو ہماری سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آیا۔ اگر آپ کچھ تفصیل سے بتا دیں تو شاید سمجھ میں آجاوے۔“

میاں سمجھو! دنیا میں تصدیق عجائبات اس قدر ہیں کہ انسان ان کو سمجھ سکتا ہے

دکھ سکتا ہے۔ دن کا ہونا، رات کا آنا، چمکدار سورج کا نکلنا، باریک چاند کا دکھائی دینا اور پھر بڑھتا جانا، بدر ہونا اور اپنی چاندنی سے اندھیری دنیا کو روشن کرنا، پھر گھٹتا جانا، اور پہلی طرح باریک سا ہو کر چھپ جانا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟"

"مگر چونکہ یہ باتیں روز مرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کا عجب بلکہ عجیب تر ہونا انسان کے خیال میں نہیں رہتا۔ اور اس سے ذہول (فراموشی اور غفلت) ہو جاتا ہے۔ مگر انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا ہے، یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے، تو عجائبات کو اس کے ساتھ لگاتا ہے۔ اور جو عجائبات اس کے ساتھ لگائے گئے ہیں، ان سب کو قبول کرتا ہے بلکہ بغیر ان عجائبات کے مذہب کی حقیقت یا اس شخص کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتا۔ (اس کے بعد حضرت نوح، سلیمان، موسیٰ، یونس، عیسیٰ علیہم السلام کے معجزات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں) یہی خیال اولیاء اللہ تک پہنچ گیا۔ جب تک ان میں کرامتیں نہ پائی جائیں، اور اس پر یقین نہ کیا جائے۔ کہ ولیوں نے مُردوں کو بھی زندہ کر دیا ہے۔ اور برسوں کی ڈوبی ہوئی برات کو دریا میں سے زندہ نکال دیا، اور جیتا اور جواں کیا۔ اس وقت تک ان کے ولی ہونے پر بھی یقین نہیں ہوتا ...... رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے، نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہ ہوں، قبول کرتے ہیں مگر یہ سخت غلطی ہے۔ کوئی مذہب جو سچا ہے، اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے، جو فطرت کے خلاف ہوں، عقل انسانی کے خلاف ہوں، اور کوئی سمجھ دار آدمی ان کو تسلیم نہ کرے، بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات، خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔ گو کہ بعد کو اس کے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اس میں بہت سے عجائبات شامل کر دیئے ہوں۔ اس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے، وہ ان عجائبات پرستوں کا شامل کیا ہوا ہے، جو قدرت کے عجائبات کو ذہول کرتے ہیں۔ اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔ خدا ان عجائب پرستوں سے بچائے۔"

از مضمون بحث و تکرار :

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں، تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، اور پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے، اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، اور ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں، اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا، اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا، جو کمزور ہوا دُم دبا کر بھاگ نکلا

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح کی تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے، واہ یوں نہیں، یوں ہے۔ وہ کہتا ہے، واہ تم جانو۔ وہ بولتا ہے، تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چڑھ جاتی ہیں دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتا ہے۔ سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستیں چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں، اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں، لپاڈگی ہونے لگتی ہے، کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا، تو غُراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا، اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرانے والا نہ ہوا، تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے۔ اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرخش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تُو تُکار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے، اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزرتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔ انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے، اور اس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو یہ مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب، شائستگی اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیئے :

سرسید کی تقاریر

مولانا حالی "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں کہ سرسید بڑی پرجوش تقریر کیا کرتے تھے۔ اس وقت تک قومی سٹیج پر تقریریں کرنے کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ سید احمد خان پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اپنی ملکی زبان میں پبلک سپیچ کی طرح ڈالی۔ سرسید کبھی کبھی تقریر کرتے، تو یوں لگتا جیسے وہ پیدا ہی اس کام کے لئے ہوئے ہیں۔ شدت جذبات سے ان کے ہونٹ کانپنے لگتے۔ آواز بھی جذبات کا لہجہ اختیار کر لیتی، اور چہرے پر موضوع کے اعتبار سے تمام تغیرات نمایاں ہو جاتے بقول حالی ———

"اس کا تماشہ ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا، جبکہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گزر چکے تھے۔ اس وقت راقم الحروف بھی لاہور میں موجود تھا ...... ۲۹ دسمبر کو جو لیکچر کہ سرسید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں، جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا۔ اس کا سماں مجھ پر ہمیشہ یاد رہے گا"۔ سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہو گا، جو زار و قطار نہ روتا ہو۔ اور جو اپنی بساط سے زیادہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ . خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔ اے بزرگان پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر آپ سے پوچھتا ہوں، کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے، تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کی دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں، اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں، جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ چوہڑے، چمار، تلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ، سب مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اس دولت سرا کے دشمن ہوتے ہیں، اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک تلی، چمار کی مانند تصور کیجئے۔ اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔ اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا، یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک تلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھایئے کیا آپ صاحب مجھ بدبخت، نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسل ڈبونا، اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو، اس سے عبرت پکڑو، اور برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو؟

۱۸۸۴ء میں پنجاب میں گورداسپور کے مقام پر سرسید کی خدمت میں وہاں کی خواتین کی طرف سے ایک ایڈریس پیش کیا گیا۔ سرسید نے اس سپاسنامے کے جواب میں کہا۔

"اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں ہے، جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی ہے، وہ میرے لئے ایسی عزت ہے، جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوگی۔ میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکر گزار ہوں۔

اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصریؒ موجود ہیں۔

تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر بار کا انتظام، ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہے، تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں، یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔

میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے، اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لئے کر رہا ہوں، درحقیقت وہ لڑکوں، لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں، نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو، جو اس زمانے میں پھیلتی جا رہی ہیں۔ مردوں کو جو تمہارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو، مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں، جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی ہے، شرکت کی ہے، وہ ایک نمونہ تمہاری محبت، یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں، اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا تعالیٰ کی برکت ہو، اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین!"

اب ملاحظہ ہو، سرسید کی اس تقریر کا اقتباس جو انہوں نے اپنے پوتے سید مسعود کی رسم بسم اللہ کی تقریب میں علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے تمام اراکین کے سامنے کی۔

— "اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے۔ مگر اس سے نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم حالت خراب میں ہے اس لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے۔ ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی اپنی عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے دو اعلانیہ ثبوت موجود ہیں۔

ایک یہ کہ سید مسعود پیدا ہوا، تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے، جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے۔ اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا، اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا، اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔ دوسرا نمونہ راجہ جے کشن داس بہادر۔ سی ایس آئی کی طرف نہایت جوش محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا، ہمارا یہ داڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے۔ اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں۔ اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں۔ اور سید راس مسعود "دادا ماجد" پس ہم اپنے دوستوں سے محبت کرنے میں کچھ فرق نہیں کرتے ہیں۔

سرسید کے مکاتیب

سرسید احمد خاں کے خطوط کا مجموعہ ان کی وفات کے پچیس برس بعد ۱۹۲۴ء میں ان کے پوتے سید راس مسعود نے شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ۲۴۴ خطوط ہیں، جو سرسید نے اپنے رفقاء کے نام لکھے، اور جن میں مسلمانوں کی ہر طرح کی قومی ضروریات اور ان کی تکمیل کے طریقوں اور تدبیروں سے بحث کی گئی ہے۔ خطوط سرسید میں ایک مقدمہ بھی ہے، جو مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل سہارنپور نے لکھا ہے۔ اب کچھ خطوط کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے؛

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے نام ——

مولوی صاحب عزیز و شفیق و مکرم من سلامت۔

بعد سلام مسنون الاسلام التماس یہ ہے کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا، حالات مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہ ہوا۔ شعر و سخن پر رقابت دوسری چیز ہے۔ الا آپس کا اتفاق دوسری چیز ہے۔ میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مذاکرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعراء نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خواب امن" پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا، اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کئے جائیں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں، ہم بیان کیا کر سکتے ہیں۔ بعد رمضان انشاء اللہ تعالیٰ ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔ ان دنوں میں بہ سبب صوم کچھ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اگر اور کوئی مثنوی اس کے علاوہ چھپی ہو، تو عنایت فرمائیے۔

پنجابی اخبار میں جو آپ کے اشعار پر رد و قدح تحریر ہوتی ہے، کون صاحب اس کو لکھتے ہیں؟ اس بات کے کہنے سے مجھے معاف کیجئے کہ یہ خیال آپ کا کہ "قرآن میں کوئی مضمون علمی نہیں، خالص فصاحت اس قسم کا معجزہ ہے؟" درست نہیں ہے۔ قرآن علم نیچر اور فصاحت سب سے معمور ہے۔ اور مجموعہ من حیث المجموع معجزہ ہے۔

خاکسار —— سید احمد از بنارس، ۲۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء

محسن الملک نواب مہدی علی کے نام۔

جناب مخدوم و مکرم۔ محب من سلامت۔ بعد سلام مسنون الاسلام

این کہ آپ کا عنایت نامہ مورخہ بلا تاریخ پہنچا۔ جس قدر خوشی مجھ کو آپ کے عنایت نامہ پہنچنے سے ہوئی ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ یہ مقولہ کہ الخط نصف الملاقات غلط، بلکہ پوری ملاقات کا لطف ہوتا ہے۔ مفارقت میں اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ میں برابر اپنے حالات لکھ کر بھیجتا رہتا ہوں۔ اخبار میں چھپنے دیجئے۔ بعد معاودت انشاء اللہ تعالیٰ نظر ثانی کر کر رسالہ سفر مرتب کر کر چھاپوں گا۔ میں حتی المقدور نہایت مفصل حالات لکھتا ہوں۔

اور جو جو مراتب آپ نے لکھے ہیں، وہ آخر کو بالتفصیل لکھوں گا۔ بعد آنے کے معلوم ہوا کہ سفر چنداں سخت نہیں ہے۔ نہایت آرام کا سہل ہے، اور کوئی چیز مذہبی ایسی نہیں ہے کہ مسلمان اس کو اپنے خاطر خواہ نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ایک شیعہ جو مشرک کو

نہیں حقیقی جانتا ہے، وہ بھی اپنے مذہب کے موافق رہ سکتا ہے، مگر کسی قدر اہتمام و تردد سے ذبیحہ مسلمان کا دستیاب ہو سکتا ہے۔ بغرض کہ کوئی بھی بات مشکل نہیں ہے۔ بعض امور بلا تکلف اور بعض امور بہ تکلف انجام پاتے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ حالات سفر جو اخبار میں چھپتے ہیں آپ ان کو بطور کتاب یکجا نقل کرواتے جائیں، اور جس امر کی نسبت زیادہ تفصیل کی حاجت ہو، مجھ کو لکھ کر دریافت فرمالیں۔ اور اس میں اضافہ کر دیں، تاکہ آپ کی اصلاح سے کتاب بھی درست ہو جائے، اور سب چیز کو حاوی بھی ہو۔ اور میرے آنے تک کتاب مرتب تیار ہوگی، اور صرف چھپنا شروع ہوگا۔ میں بعض بعض عمدہ مکانات کے نقشے بھی لاؤں گا، اور وہ بھی کتاب میں چھپوائے جائیں گے۔ بہرحال بعد نظر ثانی یہ کتاب حاوی تمام چیز کو ہوگی۔ دو ہندو واسطے امتحان سول سروس کے بمبئی سے اور آئے ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان پیچھے رہ جاتے ہیں۔

چار بنگالی اب کی دفعہ سول سروس میں پاس ہوئے ہیں۔ محمود مدرسہ قانونی میں داخل ہو گیا ہے۔ مجھ سے اور یہاں کے اراکین سے روز بہ روز ملاقات ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس قدر ملاقات کا موقع اور جگہ ہے، کہ شاید ہی ان سب سے مل سکوں گا۔ جس اخلاق سے یہاں کے اُمرا اور اراکین ملے ہیں۔ اس کا بیان و بیان سے باہر ہے۔ کچھ میرے ہی ساتھ یہ اخلاق نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت میں وہ لوگ اخلاق اور سادہ مزاج اور بے غرور ہیں۔ ہر دم اپنے ملک کی بھلائی کے خیال میں ہوں، اور عنقریب کچھ کچھ انشاء اللہ تعالیٰ مشتہر کرنا شروع کرتا ہوں۔ وزیر ہند میرے آنے کے دو تین روز بعد باہر چلے گئے ہیں۔ اوّل ان سے ملاقات خاص ہو لے، تب کچھ تحریک بہتری ہندوستان شروع ہوگی۔ قبل اس کے ایک عریضہ مع اشتہار کتاب کے روانہ خدمت عالی کیا ہے۔ ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ اور امید ہے کہ زر مطلوبہ روانہ فرمایا ہوگا۔ مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ بعض احباب نالائق مثل مولوی ز.... ج نے میرا ارادہ دوبارہ تحریر جواب کتاب میور صاحب جو نسبت آنحضرت صلعم لکھی ہے، سست کر دیا، اور بہ وقت روانگی سامان اور چندہ کرنے نہیں دیا۔ یہاں اس کے جواب کا اس قدر سامان ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً وہ عالم انگریز جس نے وہ کتاب لکھی ہے، جس کا پہلے میں نے ذکر کیا، ایسا عمدہ شخص اس کے جواب کے لائق ہے، کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا، ہوش جاتے رہے کتب خانہ نہیں ہے، کتابوں کا شہر ہے۔ مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی جو چاہوں اور نقل کی سب کی اجازت ہو گئی۔ ابھی کتب خانہ برٹش میوزیم نہیں دیکھا، سنا ہے کہ وہ اس سے بھی بہت بڑا ہے۔ بہرحال میں کچھ نہ کچھ نسبت جواب کتاب ولیم میور صاحب کے ضرور کروں گا۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ عنایت نامہ بھیجتے رہیں۔ اس کے پہنچنے سے جس قدر خوشی اور روحانی فرحت ہوتی ہے، بیان نہیں ہو سکتی۔ حافظ جی صاحب کی خدمت میں میرا بہت بہت سلام پہنچے۔ میرے ہمراہی سب بخیریت ہیں۔ آپ کو تسلیم عرض کرتے ہیں محمود کہتا ہے کہ میرا اسلام مت لکھو۔ میں خود جلد عریضہ لکھوں گا۔ وہ تصویریں مرسل خدمت ہیں۔ میں خود حاضر نہیں ہو سکا۔ اس لئے میری تصویریں آپ کی قدم بوسی کو پہنچتی ہیں۔

خاکسار سید احمد، جمعہ ۱۸ جون ۱۸۶۹ء لندن۔

"جناب مخدوم و مکرم من!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ بلا تاریخ پایا! "اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"، جس قدر مسرت دل کو آپ کے خط سے ہوئی ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی، تو شاید اس قدر خوشی ہوتی۔ جس محبت سے لکھا تھا، وہ اثر ان الفاظ میں موجود تھا، اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچتا تھا۔ جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے، ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محبت ہوا، کہ گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں سے آپ کے حق میں لکھتے ہیں، یا آپ نے میرے حق میں؟ اور اس کیفیت سے وحدت وجود کے مسئلے کا عقدہ حل ہوتا تھا۔

میاں احمد و مہدی نہ ہیچ ہست حجاب
تو خود حجاب خودی احمد از میاں برخیز

یہ بے تصنع آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کی شکستہ رقم نے اور بھی زیادہ لطف دیا۔ دو تین دفعہ پڑھنا ہوا۔ ایک دفعہ پڑھنے میں جو لفظ رہ گیا تھا، دوسری دفعہ میں نکلا، اور بہت زیادہ مزا دیا۔ اس وقت میرے دل میں مرزا مرحوم کا یہ شعر گزرا ———

ز رکنت می تپد نبض رگ لعل گہر بارش
شہید انتظار جلوۂ خویش است گفتارش

پہلے خط بھیج چکا ہوں، اشتہار آف انڈیا کی خوشخبری سنا چکا ہوں۔ میں انڈیا آفس میں صاحب سکریٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسباب بغاوت ہند" مع تمام و کمال انگریزی ترجمے کے دکھلائی۔ دیکھ کر اسے دل بہت خوش ہوا۔ جو کچھ رائیں اس کی بدولت قرار پائیں، اس کا بیان بے فائدہ ہے اہل ہند ناقدر دان دوست کش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں۔ مگر میں خوش ہوں کہ میرے ہم وطنوں کی بھلائی ہوئی۔ اب ایک اور کتاب "انتظام گورنمنٹ آف انڈیا" پر لکھ رہا ہوں۔ انڈیا کونسل کے بعض ممبروں نے فرمایا کہ ہم ایک دن فرصت کا مقرر کر کے ہندوستان کے باب میں گفتگو کریں گے۔ کچھ تھوڑی سی گفتگو نسبت انتظام پنجاب اور زائد میونسپل کمیٹی پر ہوئی۔ اگر وہ کتاب میری چھپی، اور مجھ میں اس کے چھاپنے اور انگریزی عبارت کی اصلاح میں جو خرچ ہوگا، اس کے خرچ کا مقدور ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ اور اس کتاب سے کس قدر فائدہ ہوگا۔ اور کیسا صاف صاف لکھ رہا ہوں۔ بغیر چھاپ ہونے کے اس کی شہرت اور تمام لوگوں کی توجہ اور ہر جگہ اس پر بحث و گفتگو نہیں ہو سکی اور بغیر اس کے کچھ فائدہ نہیں۔ آپ کے نزدیک جو جو باتیں قابل گفتگو زبانی ہوں گی، یا قابل اندراج کتاب ان کو بہت جلد رقم فرمائیے۔ جس دن کہ جناب اہل خانہ وزیر ہند نے دعوت میں مجھے بلایا ہے۔ اس رات وہاں مسٹر الک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا پتہ لکھ دیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا، وہ گھر پر نہ تھے۔ ملاقات نہیں ہوئی آپ کو معلوم ہے کہ کرایہ کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہے۔ دس روپیہ روز۔ میں نے کہا مرے۔ اس لئے دوبارہ نہیں گیا، پھر کسی دن جاؤں گا۔ اس وقت میرے پاس تیس چٹھیاں ملاقات کی، اور دس پندرہ ٹکٹ رکھے ہیں۔ اور یہ سب اُمرا اور لارڈ اور سر ہیں۔ صرف خرچ سواری کے ڈر کے مارے کہیں نہیں گیا۔ اور نہ خیال کر سکتا ہوں کہ کیوں کر سب سے ملوں گا۔

جو لوگ کہ میرے گھر پر آ جاتے ہیں، لاچار ان کے ہاں یا جس کے پاس نہایت ضروری جانا ہوتا ہے، وہاں جاتا ہوں۔ سو اب تک سوائے ایک دفعہ کے دوسری دفعہ کی نوبت نہیں پہنچی۔ ایک آدمی ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ میں بخوبی یہاں بہ آرام گزر کر سکتا ہے الا جبکہ آنا جانا چاہے، اور لوگوں سے ملے، اور عزت کے ساتھ جانا آنا چاہے، تو صرف سواری کا خرچ چار سو روپے ماہواری پڑے گا۔ کبھی ایک گھوڑا اور کبھی دو گھوڑے کی بگھی نصیب ہوگی۔ بعضے ایسے موقعے ہوتے ہیں کہ وہاں ضرور دو گھوڑوں پر جانا چاہیئے

گزشتہ شب صرف محمود کی ایک انگریز نے دعوت کی تھی۔ دو گھنٹے ان کو وہاں لگے اور ایسے سٹرل اکہ گاڑی میں وہاں گئے تھے، جیسے بنارس میں دو دو تین تین آنہ کرایہ

کے اگے ہوتے ہیں، سات شلنگ یعنی سات روپیہ آٹھ آنے خرچ ہوئے۔ اب موافق یہاں کی رسم کے دوسرے یا تیسرے محسن صاحب خانہ سے ملنے ضرور جانا چاہیئے۔ اس قدر پھر خرچ ہوگا صرف ایک دوست کے ہاں بلا تکلف جانے میں سات روپیہ خرچ ہوئے۔ پس مجھ کو خرچ کی بڑی فکر ہے، اور نہایت اندیشہ ہے کہ کیا ہوگا۔ اس لئے حد سے زیادہ تنگی سے خرچ کرتا ہوں۔ تصویریں تمام بادشاہوں کی اور سلطان روم کے جلسے کی سب ہیں۔ نہایت عمدہ کتاب جس میں قرینہ سے سب تصویریں تمام بادشاہان روئے زمین کی حسب خواہش لگی ہوں، اور کتاب البم فرانگشی جب خاطر خواہ تیار ہو، تو سو ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوگا۔ میں نے تو قسم کھائی ہے۔ اگر آپ کو شوق ہو تو زر عنایت ہو، بندہ سب طرح تیار کرا کر بھیج دے گا۔ حماقت سے اس فرنگی کی کتاب چھپوائی ہے۔ ۵۰ تو خود چندہ میں دیئے اور اگر ان لوگوں کے پاس سے روپیہ نہ آیا، تو کئی سو روپیہ کا دھپ لگے گا۔ کیونکہ جن احباب کو لکھا ہے، ان میں بعض ایسے بھی ہیں، جن سے اس کی تعمیل کی توقع نہیں ہے۔ اور وہ کتاب قریب نصف کے چھپ چکی ہے۔ دو ہفتے میں تمام ہو جاوے گی، اور چھاپہ خانہ کا بل میرے نام پر پہنچے گا۔ مولوی امداد العلی صاحب کا نہایت شکر گزار ہوا کہ بخیر یاد کیا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمام اہل ہند اور خصوص مسلمان بخیر یاد کریں، بلکہ اپنا غلام سمجھیں۔ التزام تقلید غیر کو شرک فی صفتہ النبوۃ کہنے سے توبہ کرتا ہوں۔ توبہ۔ توبہ۔ مگر دل سے نہیں۔

زیں توبۂ ناصواب توبہ

محمود سے میں نے کہا کہ تمہاری طرف سے کچھ لکھ دوں، اس نے کہا کہ آپ کچھ نہ لکھئے میں خود لکھ رہا ہوں۔ جناب مولوی معین الدین صاحب کو سلام پہنچنے سے مجھے شاہ کو ایشیا کی خوشی سے کچھ کم خوشی نہیں ہوئی۔ میرا بہت بہت سلام مسنون، بجز و نیاز دست بستہ عرض کر دیجئے گا۔ والسلام۔

خاکسار محبت گزین شما سید احمد مقام لندن، ۱۸ جون ۱۸۶۹ء

مخدوم و مکرم بندہ سلامت!

بعد سلام مسنون التماس یہ ہے کہ جس کتاب کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے دیکھا تھا، وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس روانہ کروں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیا انصاف اور کیا سچ اختیار کیا ہے گو بعض خیالات اس کے تمہارے خیالات کے مطابق نہ ہوں، وہ مسلمان نہیں ہے۔ انگریز ہے جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے، تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔

اب ایک اور بات ضروری ہے، جو لکھتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھتی ہیں، اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہی تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں، جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب کے تمام مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے، اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو، نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔ دو بہت بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں، جن سے مسلمانوں کو نہایت گہرا تعلق ہے۔ ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے، جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی انگریزوں پر یعنی عیسائیوں پر حکومت رہی۔ اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اس قوم کی کی نہایت ہی عجیب اور قابل فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے، یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور تمام عیسائی لوگوں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے ان عالم صاحب سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعات کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں، اور ان کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو، اور جس کا قصور اس میں ان کی منصفانہ حاشیے میں ہو، سب لکھیں، اور چونکہ وہ عالم صاحب نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے، اور جرمن، لیٹن، فرنچ، گریک زیادہ جانتا ہے، اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے۔ صرف انگریزی کتابوں پر اس کو بھروسہ نہیں ہے۔ اس لئے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اس نے یہ کتاب لکھی ہے، ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً خرچ ہوگا۔ فی کتاب چار سو روپیہ۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کرا کر میرے پاس بھیج دیں۔ چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیئے، اور صرف احباب مخلصین سے چندہ ہو۔ مثلاً آپ میر ظہور حسین زین العابدین، مرزا رحمت اللہ اور دیگر احباب سے ملاقات کریں، اور زبانی بات چیت کریں۔ اور جس کی جو توفیق ہو، اس سے لے کر جمع کریں۔ نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ میں احباب کا نام لکھتا ہوں، اور اس میں مولوی س۔ ا۔ خ کا نام نہیں لکھا، اور جو کہ اب وہ اپنے تئیں اتقا میں جنید و شبلی والی حنیفہ سے مقدم اور اور لوگوں کو یا فاسق یا گناہ گار یا کافر مرتد سمجھتے ہیں دانائی اور دوراندیشی میں بھی اپنی برابر کسی کو نہیں جانتے، اور ایک حقارت کی نگاہ سے ہر ایک کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ آپ ان سے کچھ تذکرہ اس کا کریں۔ اور حقیقت میں وہ شریک نہیں ہونے کے اور نہ دیں گے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔

ایک عجیب بات سنئے، کہ جو کتاب چھپ چکی ہے، اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ جو الزام جلا دینے کتب خانہ مصر کا نسبت حضرت عمر لگایا جاتا ہے، غلط ہے۔ یونانی و رومی تاریخوں سے ثابت کیا ہے، کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر کے وقت میں جلا (بیوقوف شیخی پسند بعض ناواقف مسلمان مورخوں نے اس واقعہ کو مسلمانوں نے جب فتح مصر کی، اس کے ساتھ لگا دیا) اس امر کا ایسا مستحکم ثبوت دیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔

(مواعظ احمدیہ) ایک وعظ تیار ہو گیا ہے۔ انگریزی میں ترجمہ ہو گیا، اب انگریزی میں چھاپہ شروع ہوگا۔ اردو کتاب کے چھاپہ میں بہت لاگت لگتی ہے۔ بعد چھاپہ چند نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا (تا دانم کہ مخدوم می چہ می گویند) والسلام

خاکسار سید احمد، ۲۳ جولائی ۱۸۶۹ء لندن۔

جناب مخدوم و مکرم!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۸ جون پہنچا عجیب اتفاق ہے کہ میرا نیاز نامہ مورخہ ۲ جون آپ کے پاس پہنچا، اور جو عریضہ مع اشتہار کتب اس سے پہلے روانہ کیا تھا، وہ نہیں پہنچا غالباً پہلا عریضہ سو تھمپٹن کی راہ گیا، جو نہایت پھیر کا راستہ ہے، مگر امید ہے، بعد اس کے پہنچ گیا ہوگا۔ ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر جان ڈیون پورٹ ہے، حمایت مذہب اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حال لکھا ہے۔ اور جس قدر اتہام و الزام انگریزوں نے آنحضرت صلعم پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں، اس کا جواب دیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی، اس کا چھاپہ ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا۔ میں نے کل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی، اور احباب سے پچاس پچاس روپے اس کی لاگت ادا کرنے کو طلب کئے تھے۔ پس اگر وہ خط نہ پہنچا ہو، تو آپ فی الفور پچاس بھیج دو۔ وہ کتاب تیار ہو گئی، چھپ چکی، آئندہ میل میں روانہ کروں

گا۔ تصویر مسٹر ڈیون پورٹ کی بھیجتا ہوں۔ نہایت تعلیم و ادب اور محبت رکھنے کے لائق آدمی ہے۔ جن لفظوں میں، میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا، اور جس سے آپ کو افسوس ہوا، اس کا عذر کرتا ہوں، اور معافی چاہتا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر ہندوستانی نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں، افسوس کہ مجھے ایسے لفظ لکھنے نہ آئے، جس سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجئے۔ جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا، تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کروگے۔ بھائی کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ جو بُرا کروں، اور اس کو اس لئے چھپاؤں کہ لوگ بُرا نہ کہیں۔ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے، جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہوسکتا۔ جو کام کرتے ہیں، وہ دیکھتا ہے، جو بات کہتے ہیں، وہ سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں، وہ جان لیتا ہے۔ ایسا پیچھے پڑا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے، نہ زمین پر چھوڑے، نہ ولایت کو الگ ہو۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی، تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈر کرنا۔ میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں، نہ روایت شاذہ سے۔ بہر حال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا۔ شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف معافی چاہتا ہوں اور آپ سے نہایت سچے دل سے التجا کرتا ہوں کہ بعضے آقاؤں کے نہایت بدخصلت اور بدکردار غلام ہوتے ہیں۔ وہ آقا اپنے غلام پر ناراض تو ہوتے ہیں، مگر اس غلام کو غلام سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح گو آپ میری حرکات ناشائستہ سے ناراض ہوں، مگر مجھ کو اپنا غلام سمجھتے رہیں۔ بر من منگر بہ کرم خویش نگر۔ یہ الفاظ میں نے نہیں لکھے، میرے دل نے لکھے ہیں۔

والئ مصر کے ساتھ بعض علماء مصر بھی تھے۔ انگریزوں کے ساتھ بغیر ذبح کئے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔

میں دو دفعہ ہالک صاحب کے پاس گیا۔ ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چار پانچ روز ہوئے، کہ وہ از راہ عنایت میرے مکان پر مجھ سے ملنے آئے۔ بہت عنایت سے ملے، اور بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ میں نے عرضی پیش کی، اور بہت کچھ کہا، اور جو امداد کا وعدہ انہوں نے کیا تھا، وہ یاد دلایا۔ انہوں نے بہت غور سے سنا، اور غور و فکر کرتے رہے۔ اور کہا کہ ہمارے پاس بھی ان کی انگریزی چٹھی آئی ہے۔ میں نے صاحب کلکٹر بہادر مرزاپور کے نام چٹھی لکھنے کو کہا۔ بعد تمام گفتگو کے یہ جواب دیا کہ ہم لکھیں گے اور مہدی علی کو بھی خود لکھیں گے۔ اب وہ منقل میں چلے گئے۔ دو مہینے بعد آویں گے اور وعدہ کرگئے ہیں۔ بعد آنے کے تم سے بہت دفعہ ملوں گا، اور بہت بات چیت کروں گا۔ پس اگر انہوں نے اس عرصہ میں کچھ نہ کیا، تو جب واپس آویں گے، پھر ذکر کروں گا۔

میں آپ کے لئے تصویرات جمع کر رہا ہوں، اور نہایت سلیقہ سے عمدہ البم میں لگاؤں گا۔ اور مکانات کی تصاویر بھی لیتا جاتا ہوں۔ آپ اس قدر عذرات مغائرانہ وصاحب احسانے قیمت کیوں لکھتے ہیں؟ میں نے خود تم سے قیمت طلب کی ہے؟ میں تم کو اپنے بھائی کے برابر سمجھتا ہوں۔ تم سے روپیہ منگانے یا لینے میں بروقت ضرورت یا بحالت ناچاری کچھ شرم نہیں ہے۔ بلا شبہ مجھ کو خرچ کی بہت تنگی ہے۔ ان تصویروں میں جو خرچ ہوگا، تم کو دینا ہوگا، بلکہ سو ڈیڑھ سو روپیہ اس کام کے لئے پیشگی بھیج دو، تو اور بھی بہتر ہے، اگر میں نے جمع کرنا شروع کردی ہیں۔

کتب خانہ انڈیا آفس کی کوئی چھپی ہوئی فہرست نہیں ہے۔ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی میں، عربی، فارسی نہایت قلیل متعدد کتابیں ہیں (؟)۔ کتب خانہ برٹش میوزیم ایک بہت بڑا جنگل کتابوں کا ہے۔ کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں، اس میں سے تفسیر یا قوت التاویل کا حال دریافت کرکے آئندہ میل میں لکھوں گا۔

میور صاحب کی کتاب کے جواب کا سامان نہیں ہوسکا۔ اب اس کی توقع نہیں کہ انگریزی خواں اور ایک طالب علم جو مقامات نشان دادہ کو کتب میں تلاش و نقل کر سکتا، میرے ساتھ ہوتے تو ایک برس میں اس کا جواب لکھ لاتا۔ اب نہیں ہوسکتا۔ مگر میں اس کے مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ رہا ہوں۔ اور اس کا نام "مواعظ احمدیہ" رکھا ہے۔ پہلا وعظ تیار ہوگیا۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں معتبر و غیر معتبر اور صحیح و غلط روائتیں شامل ہیں۔ اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی ہر ایک بات کو اصلی مذہب سمجھا جائے، پس جن لوگوں نے ہماری کتابوں کی روائتیں چن چن کر ہمارے مذہب پر یا پیغمبر خدا صلعم کی نسبت الزام و اتہام دیا ہے، وہ حماقت ہے، کیونکہ اول یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ روایت صحیح و معتبر بھی ہے، یا نہیں۔ مگر اس کا طرز گزارش سیدھا صاف نہیں ہے۔ پیچ دار شمشیر برہنہ ہے۔ اس کے مصنف کے دل میں بجز مذہب اسلام کی محبت اور کسی کی محبت نہیں ہے۔ اس نے اس طرح پر یہ وعظ لکھا ہے، جیسی کہ مولوی اسماعیل صاحب نے محبت توحید میں "تقویۃ الایمان" لکھی ہے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے مسائل اجتہادی اور قیاسی اصلی مذہب مسلمانوں کا نہیں ہے، وہ صرف ایک قانون دان کی رائے ہے۔ اگر ہزار ابو حنیفہ و شافعی کے مسائل اور اجتہادات غلط ہوں تو مذہب اسلام کی موزونیت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ پس کسی مجتہد کی رائے پر اعتراض کرکر مذہب اسلام کو غلط قرار دینا بجز حماقت کے اور کچھ نہیں۔ باقی حالات آئندہ ڈاک میں لکھوں گا۔ حافظ جی صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض کرکر کہنا، کہ آپ بھی میری غیر مذبوحہ مرغی سے ناراض ہوئے ہوں تو للّٰہ معاف فرمائیے گا   والسلام

خاکسار سید احمد ۶ر اگست جمعہ۔ لندن ۱۸۶۹ء

"مخدوم من و محبوب من سلامت!

نامہ محبت مورخہ ۸ر جولائی پایا۔ ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلعم کے حال میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا۔ اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہوجائے، اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں، تو بلا سے۔ قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا، کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔

ع   مارا ہمیں تمغہ شہنشاہی بس است

میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کردیں۔ چٹھیات روانہ ہوگئیں۔ سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خرید لیں۔ ایک آدمی مقرر کرلیا جو لیٹن کا ترجمہ کرکر مضمون بتلا سکے۔ تین مقدمات لکھنے شروع کردیئے۔ اول جغرافیہ عرب دوئم انساب عرب۔ سوئم ثبوت آنحضرت صلعم کی نسل کا حضرت ابراہیم تک۔ سب سے مشکل کام جغرافیہ ہے، اور تمام چیزوں کے متعلق اسلام و سیر کے ثبوت کی بنیاد ہے۔

خیر اب دعا کرو، خدا مدد کرے، اور انجام کو پہنچائے۔

ہرچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم

ایک نہایت عمدہ ثبوت نسل ابراہیم سے ہونے کا یہ ہے کہ بنی ہاشم اور دیگر اقوام عرب میں جو اولاد حضرت ابراہیم سے ہیں، رسم ختنہ جاری تھی۔ آپ تلاش کریں کہ کسی کتاب میں یا حدیث و سیر و تفسیر میں کوئی ایسی قوم بھی عرب میں پائی جاتی ہے، جس میں رسم ختنہ نہ ہو۔ عرب میں سوائے اولاد حضرت ابراہیم کے اور قومیں بھی آباد تھیں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ان قوموں میں رسم ختنہ نہ تھی، تو نہایت عمدہ بات ہے۔ نقول مقامات جو سابق میں طلب کی ہیں، یقین ہے کہ اب تک روانہ ہو چکی ہوں گی۔ بشرطیکہ حافظ جی نے مہربانی کی ہوگی۔ میرا سلام اور بہت بہت سلام ان سے کہیئے۔ اس بات کے دریافت ہونے سے کہ صاحب کمشنر بہادر نے آپ کی خلعت کے لئے رپورٹ کی حد سے زیادہ خوشی ہوئی۔ خدا مبارک کرے۔ اس کی منظوری سے انشاءاللہ جلد خوشی حاصل ہوگی۔ بھائی مہدی تم پانیئر اخبار الہ آباد میں سے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو وہ لکھتا ہے " آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں، وہ بھی ضعیف ہیں۔ جلد پنشن لیں گے، اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان معزز عہدے پر نہیں ہوگا" دیکھو جو میں کہتا تھا، اور جس کا غم کرتا تھا، اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹیکل بہت بڑا ہے، اور کہیں سے دستیاب ہو، تو منگا کر بالکل سنو۔ بہر حال جو عزت خدا نے تم کو دی، وہ تمام قوم کی عزت ہے، خوشی ہے۔ ایک تو جی دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ با اقبال رکھے۔ حامد کچھ دل پڑھنے پر نہیں لگاتا۔ بہر حال گھر میں پڑھتا ہے۔ سو روپیہ مہینے کا آدمی نوکر ہے، جو تین گھنٹے آکر حامد کو اور لیٹن محمود کو پڑھا جاتا ہے، مگر حامد کا دل نہیں لگتا۔

دربار ملکہ معظمہ کی حاضری کے لئے مجھ سے کہا گیا۔ مگر میں نے بعض مصلحت کی نظر سے کہا ہے، کہ پھر کسی دربار میں حاضر ہوں گا۔ ہمیشہ دربار ہوتے ہیں۔ یہاں کے امراء سے دوستانہ ملاقات نہایت بے تکلف ہوتی ہے، اور کھانے پر جانا ہوتا ہے۔ ہمیشہ محمود میرے ساتھ ہوتا ہے، اور وہ ذریعہ گفتگو اکثر ہوتا ہے۔ وزیر ہند سے ایک دفعہ مع حامد محمود ملاقات ہوئی تھی، اور دو دفعہ میں تنہا ملا تھا۔ میں نے انگریزی میں ان کی سب باتوں کا جواب دیا۔ سب سمجھا، اور سب جواب صحیح دیئے۔ مگر نہایت بد و خراب انگریزی میں۔ یہاں کے اکثر امرا اور ممبران پارلیمنٹ ہندوستان کے خیر خواہ ہیں۔ مگر چونکہ حالات سے بخوبی واقف نہیں ہیں، اس لئے بعض کچھ جانتے ہیں اور بعضوں کی رائے نہایت غلط ہوتی ہے حال کی پارلیمنٹ میں جو بل مزید اقتدار گورنر جنرل ہندوستان پاس ہوا ہے۔ درحقیقت ممبران پارلیمنٹ نے نہایت نیک نیتی سے اور ہندوستان کا فائدہ سمجھ کر پاس کیا ہے۔ مگر ایسی غلط بنا قائم کی ہے، جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے ہے۔ اگر انگلستان میں یہ قانون جاری ہوتا، تو سب رعیت اس کی منسوخی کی درخواست کرتی۔ میونسپل کے قانون سے میں مخالف الرائے نہیں ہوں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ حکام انگریزی اس روپیہ کو بے جا صرف نہ کریں۔ ٹیکس کے باب میں کچھ گفتگو نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت آمد و خرچ پورا نہیں ہے۔

وہ کتاب تیار ہو گئی، آج کی ڈاک میں دو جلدیں میر ظہور حسین صاحب کے پاس بھیجی ہیں۔ اس لئے الہ آباد کے بعض عقلمند صاحب فرماتے تھے کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ اگلی ڈاک میں آپ کے پاس دو جلدیں روانہ کروں گا۔

خاکسار سید احمد، ۲ر اگست ۱۸۶۹ء لندن۔

جناب مخدوم مکرم بندہ سلامت!

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ دو قطعہ عنایت نامہ معہ ہنڈوی سو روپیہ کے پہنچے اور ممنون عنایت کیا۔ اپنے سفر کی بابت جو آپ نے مجھ سے رائے پوچھی ہے۔ درحقیقت آپ کی رائے بالکل صحیح ہے۔ اگر آپ یہاں تشریف لائے تو کچھ فائدہ جو معاوضہ اس قدر زیر باری کا ہو، نہیں ہونے کا۔ میں ہرگز صلاح نہیں دیتا کہ آپ اس قدر زیر باری صدمہ اٹھاویں، اور بیس روز کے لئے یہاں تشریف لائیں۔ یہ اس قدر بڑا شہر ہے، اور ایک ایسا کارخانہ ہے، کہ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ میرے واسطے جو کچھ یہاں ہوا، آپ اس کو تعجبات اور امور اتفاقیہ سے سمجھیئے۔ صاف صاف بات یہ ہے کہ یورپ دو آدمیوں کے کام کا ہے۔ اول ان کا جو جوان نو عمر ہیں، اور علوم و فنون جدیدہ کی تربیت چاہتے ہیں، اور یورپ کی زبان سے واقف ہیں۔ دوسرے صرف ان لوگوں کے لئے جو صرف سیر کے خواہاں ہیں، یا اپنے ملک اور اپنے ملک کے لوگوں کی ترقی میں کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ سیر کا تو مختصر حال یہ ہے کہ یہاں وہ چیزیں اور وہ کارخانے اور وہ عمارت اور ایسی عجائبات ہیں کہ امکان نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس کو نہیں دیکھا ان کے سامنے بیان ہو سکیں، اور وہ سمجھ سکیں۔

جس وقت انسان یورپ کی سرحد میں پہنچتا ہے، حقیقت میں اس کو ایک نیا عالم معلوم ہوتا ہے، اور اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں جا کر انگریز ہم کو مثل جانور کے جانتے ہیں، دراصل ہم ہندوستانی ایسے ہی ہیں۔ عقلمند اور عبرت اور نصیحت پکڑنے والا آدمی تمام حالات اور رسم و رواج یورپ دیکھ کر یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ کون سی رسمیں اور عادتیں ہندوستان کی، اور خصوصاً مسلمانوں کی اچھی ہیں، اور کون سی خراب، اور قابل تبدیل ہیں۔ اصول ایمانیہ اسلامیہ پر جس قدر یقین یورپ کے آنے سے اور یہاں کے حالات اور علوم اور علماء کی رائیں دریافت کرنے سے ہوتا ہے۔ بلا تشبیہ نعوذ باللہ، ویسا یقین حج سے نہیں ہوتا۔ زیادہ تعجب یہ دیکھ کر ہوتا ہے۔ کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، آپس میں ہو رہا ہے، گورنمنٹ سے کچھ علاقہ نہیں ہے، اور یہ دیکھ کر آدمی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں اگر بہت سے آدمی متوجہ ہوں، اور علوم و فنون اور سویلیزیشن پر کوشش کریں تو وہ بلا اعانت گورنمنٹ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ان خیالات سے اور حال دیکھنے سے عقلمند اور بیدار آدمی کو اپنے ملک کی ترقی اور بھلائی اور قومی خیر خواہی زیادہ بڑھتی ہے۔

جس شخص کے پاس روپیہ ہو، اس شخص کو صرف اس قدر کافی ہے کہ یورپ آوے اور تین چار مہینے موسم گرما میں جب کہ یہاں سب کچھ جاری ہوتا ہے، ہر ایک چیز کی سیر کرے، اور چلا جائے۔ اور اپنے ملک میں اس بھلائی کو پھیلائے۔ مگر میں ہرگز رائے نہیں دیتا کہ اس امر کے حاصل کرنے کو قرض سے اپنا گلا بند کر دیوے۔ پس میں آپ کو ہرگز رائے نہیں دیتا کہ آپ قرض کر کر یہاں تشریف لائیں، اور بالفرض اگر آویں بھی تو چھ مہینے سے زیادہ کے لئے آنا محض حماقت ہے۔ میرے حال پر خیال نہ کیجیے۔ میرا حال جدا تھا، اور چند خیالات مجھ کو تھے۔ میں نے جائیداد بیچی، اور دس ہزار کا قرض کیا۔

عاقل و عیاش آدمی کے لئے جو خوشی اور نعمت یہاں متصور ہے، خدا معلوم بہشت میں بھی ہوگی، یا نہیں۔ میرے ایک بڑے معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے ہوئے کئی سو مرد، میم اور لیڈی نہایت خوبصورت و خوش کلام اور قابل حج تھیں، پوچھا

" کہو لندن بہشت ہے، اور حوروں کا ہونا سچ ہے، یا نہیں؟"

پس مختصر حال و نتیجہ سفر یورپ کا یہ ہے، مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بیجا تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے، اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے اس میں بھی وہ حماقت اور نالائقی اور گمراہی ہے، جو اور تمام کاموں میں ہے۔ پس کوئی کیا کرے۔ بد اقبالی و بدنصیبی کا کوئی علاج نہیں۔

میں روز و شب تحریر کتاب سید مصطفوی صلعم میں معروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب، ادھر فکر بجواب اعتراضات۔ ادھر فکر تنقیح روایات صحیح میں مبتلا رہتا ہوں، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ ادھر جب حساب دیکھتا ہوں، تو جان نکل جاتی ہے، کہ ابھی لکھوانا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آئے گا؟ مسلمان البتہ اسپیچیں پڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے، کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ۔ مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو، تو جان بچا دیں گے۔

دوسرا باب جس میں عرب کا جغرافیہ اور وہاں کی قوموں کا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے وہاں آ کر آباد ہونے کا ذکر ہے، چھپ رہا ہے۔ عرب میں سے ایک کتبہ نکلا ہے، جو یہاں کے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ وہ کتبہ آنحضرت صلعم سے بہت پہلے کا ہے اور اس سے حضرت ہود کا عرب میں پیغمبر ہونا اور قوم عاد کے مکانات کا وجود بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کتبہ بعینہٖ اسی خط میں مع ترجمہ میری کتاب میں مندرج ہوگا۔

میری دانست میں نہایت خیر خواہی اسلام کی اور سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں چھاپی جائے۔ اس لئے انگریزی کا چھاپنا شروع کر دیا، اور اردو ابھی ملتوی ہے۔ علاوہ اس کے انگریزی عبارت لکھنے والے جیسے عمدہ اور کم قیمت پر بہ نسبت ہندوستان کے ملے ہیں، ہندوستان میں ممکن نہ تھا۔ جو شخص کہ میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے، اس کی لیاقت کا کوئی انگریز ہندوستان میں نہیں ہے۔ اگر میری کتاب تیار ہو گئی، جس میں دس باب ہیں، تو میں لندن میں آنا دس رنج برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔ آمین!

اس معاملے میں سوائے تمہارے میں اور کسی کو کچھ نہیں لکھتا۔ اس لئے کہ جو کہ میرے دلی دوست ہیں، ان کو خدا نے عقل نہیں دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک دل سے شوق نہ ہو، صرف خاطر سے کچھ کرنا فائدہ مند نہیں ہوتا۔ بہر حال مجھ کو اعانت کی نہایت ضرورت ہے۔ اول تو انتخاب و تحریر متعلقات کتب و تحقیق بعض مسائل کی جو میں آپ کو لکھوں، آپ اس کو بخوبی انجام دیں گے۔ اس میں کچھ تامل نہیں۔ مگر اس قدر دیر نہ ہو، جیسی کہ اب تک کی ہے۔ اس وقت تک حدیثیں معراج و شق صدر کی نہیں پہنچیں۔

دوسرے بلاشبہ روپیہ کی ضرورت ہے کم از کم دو ڈھائی ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ آپ وہاں احباب مخلصین سے چندہ کیجئے، صورت چندہ کی یہ ہو کہ جو جس کا مقدور ہو دے۔ اور بعد تیار ہو چکنے کتاب کے جس قدر روپیہ اس نے دیا ہے، اسی قدر قیمت کی کتابیں اس کو دے دی جاویں۔ اس چندہ کرنے میں یہ خیال نہ کرنا چاہیئے، کہ کل ڈھائی ہزار کا چندہ ہو۔ کیونکہ جس قدر ہو وہی غنیمت ہے، اور اسی قدر بوجھ ہلکا ہوگا۔ میرا ارادہ ہے کہ میں میر ظہور حسین، مرزا رحمت اللہ بیگ، مولوی زین العابدین، تراب علی، محمد احمد، مہدی علی وغیرہ کو خط لکھوں، کہ مجھے ضرورت ہے سو سو روپیہ بھیج دو۔ سوائے اس کے اور کچھ نہ لکھوں۔ یقین ہے کہ یہ لوگ بھیجیں گے۔ پس جس قدر مدد ہو گی، غنیمت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے، کہ کسی مہاجن سے کچھ روپیہ قرض لیا جائے، اور اس کتاب کی تیاری میں لگا دیا جائے۔ بعد تیاری کے کچھ شبہ نہیں ہے، کہ یہ کتاب بہت بکے گی، اور انگریز بہت لیں گے۔ آج تک مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب آنحضرت صلعم کے حال کی انگریزی میں نہیں۔ پس اس کی قیمت سے اس کا روپیہ دیا جائے۔ اگر نقصان ہو، تو میں اور وہ لوگ جو اس میں شریک ہوں، ادا کریں۔

چند بڑے قابل انگریز جو مسلمان ہو گئے ہیں، ان کی لکھی ہوئی کتابیں نہایت تلاش سے ہم پہنچائی ہیں، اور دس گنی قیمت دے کر خریدی ہیں، اس میں ایک کتاب ہاتھ آئی ہے، جس میں اس انگریز نے نہایت خوبی سے "یاتی من بعدی اسمہ احمد" کے فقرہ کو ثابت کیا ہے، کہ ایسی دلیلیں کسی مسلمان مولوی کے خیال میں بھی نہیں گزریں۔ علاوہ اس کے میں کیا کیا بیان کروں، کہ میں نے کیا کیا ہے۔ اگر تم یہاں ہوتے، تو شاید پھولے نہ سماتے۔

بالفعل میں آپ سے عرض کرتا ہوں، کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت "اسٹار آف انڈیا" تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ خواہ اس کو کوئی میری خیر سے حاصل کرے، خواہ میرے حسد سے۔ خواہ میرے ذلیل کرنے کو "چشم ما روشن دل ما شاد" ان کا یہ فرمانا کہ سید احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر "سٹار آف انڈیا" لیا، اور انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر۔ نہیں نہیں بھول گیا ان کے مونچھیں نہیں ہیں، داڑھی پر ہاتھ پھیر کر، میرے سر اور آنکھوں پر۔ خدا کرے کہ ایک ان کو اور ہزار مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔ حافظ جی صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام، اور جب انتخاب حدیث پہنچے گا، جب شکریہ بھی ادا کروں گا۔ جناب مولوی معین الدین صاحب کی خدمت میں السلام علیکم

خاکسار سید احمد، ۱۰ ستمبر ۱۸۶۹ء لندن

جناب عالی!

آپ کا عنایت نامہ بلا تاریخ پہنچا۔ تیسری ستمبر کو میں نے بہت بڑا خط لکھا تھا۔ میرے مضمون اور مطالب اس میں تھے، افسوس کہ اس تاریخ کا میل جو جہاز لے کر چلا تھا، وہ عدن کے قریب ڈوب گیا۔ میں نے بہت صاف صاف رائے آپ کو لکھی ہے۔ دربارۂ سفر ولایت۔ انشاء اللہ یقین ہے، پہنچے گی۔ اب میرا حال سنیئے۔ "مواعظ احمدیہ" کے لکھنے میں شب و روز معروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا، ملنا جلنا، سب بند ہے۔ آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی حیات مبارک تک کا حال لکھ چکا، اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے، سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، مگر ایسا جواب نہیں ہے جیسا کہ تمہارے ہاں کے ملاں مشرکین فی صفۃ النبوۃ دیتے ہیں۔ نہایت محققانہ جواب ہیں۔ اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو، وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو۔ اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام، ورنہ میرا نام ہی نہیں۔ اپنی تحریر کو آپ ہی دیکھتا ہوں، اور خوش ہوتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ دوسرا خطبہ جغرافیہ عرب کا قریب الاختتام ہے۔ نہایت عمدہ طور سے ثابت ہوا کہ فاران وہی میدان اور پہاڑ ہیں، جہاں کعبہ واقع ہے۔

معلوم نہیں کہ آپ فاران کے نام سے واقف ہیں، یا نہیں۔ کیونکہ یہ بہت بڑا ارگن بلانے کا ہے۔ جس قدر لکھا ہے، وہ انگریزی ہو گیا، اور چھپ رہا ہے۔ اس وقت میرے سامنے دوسرے خطبے کے ۲۴ ورق چھپے ہوئے رکھے ہیں۔ پہلا خطبہ جو تیار رکھا ہے، ایک نسخہ اس کا آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اور جب دوسرا ختم ہو جاوے گا، اس وقت وہ بھی بھیجوں گا۔ اور علیٰ ہذا القیاس۔ مگر اس بات کی احتیاط رہے کہ اس کتاب کی تصنیف کی شہرت نہ ہو، اور جب تک کہ کتاب پوری نہ ہو لے، اور چھپ نہ لے، اس وقت تک کسی کو نہ معلوم ہو کہ ولیم میوٗر صاحب کی کتاب کا جواب لکھا ہے۔ پس اغیار سے اس کو مخفی رکھنا چاہیئے، کیونکہ میں نہیں چاہتا، کہ قبل اتمام کتاب جناب سر ولیم میوٗر صاحب کو اس کا حال معلوم ہو۔

بعد اتمام انشاء اللہ تعالیٰ میں خود اپنے ہاتھ سے نذر دوں گا۔ اب بجز روپیہ کے اور کسی چیز کی فکر نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین صاحب کے پاس جائیے۔ اور میری یہ درخواست ہے کہ دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے۔ سود اور روپیہ میں ادا کردوں گا۔ مگر چونکہ میں یہاں ہوں، اس لئے کچھ بندوبست نہیں کر سکتا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف مسی تک فروخت کر کر ہزار روپیہ بھیج دو۔

مرزا رحمت اللہ بیگ کا کوئی خط نہیں آیا۔ ان کا حال لکھو۔ وہ کیسے ہیں۔ والسلام۔

خاکسار سید احمد، ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۹ء لندن ؟

مولوی مشتاق حسین صاحب نواب وقار الملک بہادر
کے نام

بھائی مشتاق حسین! کل میں سارا دن متردد رہا، کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا، اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں، اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا۔ اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں، اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے، مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا، نہایت بُرا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں، یا قضا کریں۔ لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سہی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے۔ جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا، یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے، جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا، جو کبھی اس قسم کی بحث چھڑتی ہی نہ

ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا، اور گڑگڑانا کیسا؟ حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفا دے دینا تھا۔ اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے، اپنے خدائے عظیم الشان، قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا، نہ آپ کی۔ کیا ہوتا نوکری نہ میسر ہوتی۔ فاقے مرجاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام

خاکسار سید احمد، بنارس ۹۷، ۱۸ء

نواب انتصار جنگ بہادر کے نام

عزیزی و مکرمی انتصار جنگ بہادر۔ اسماعیل شاہ خاں کا حال نہایت ابتر ہے

انہوں نے معلوم نہیں کہ کس سبب سے نوکری چھوڑ دی۔ یہاں انہوں نے ہر چند کوشش کی، مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ جب میں نینی تال تھا، تو وہ راجہ کاشی پور کے پاس امیدوار تھے۔ اور نینی تال آئے تھے۔ اتفاق سے راجہ کاشی پور بھی مرگئے۔ انہوں نے تمہارے پاس حیدر آباد جانے کا ارادہ ظاہر کیا، اور مجھ سے ایک خط کے طلب گار ہوئے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ بلا اجازت کسی کے پاس جانے کی میں اجازت نہیں دیتا۔ اور نہ میں کسی کو خط دے کر کسی کے پاس بھیجتا ہوں، اور نہ میں کسی کے لئے سفارش کرنا پسند کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے وہاں جانے کا پکا ارادہ کیا ہے، اور ضرور جاؤں گا۔ اور بلا طلب و اجازت جاؤں گا۔ میں نے جواب دیا کہ بہتر۔ اب وہ دو تین دن سے علی گڑھ آئے ہوئے ہیں، اور حیدر آباد کے سفر میں ہیں، اور پھر خط کے طالب ہیں۔ حقیقت میں ان کا خط طلب کرنا ایک فضول امر ہے۔ آپ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اگر آپ کچھ ان کے لئے کر سکتے ہیں، تو بغیر میری تحریر کے بھی کر سکتے ہیں۔ مگر جب انہوں نے نہایت اصرار کیا، تو میں نے کہا کہ میں تم کو خط نہ دوں گا۔ مگر سب حال لکھ بھیجوں گا۔ غرض کہ وہ روانہ ہوتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب تمہارے سر جا پڑیں گے، تو مجبوراً کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ اب کے وہ جاتے ہیں، تو تمہارے سر پر آتے ہیں، تو میں بھی اس قدر لکھنا مناسب جانتا ہوں، کہ در حقیقت وہ نہایت تنگی میں ہیں، جس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ پس مجھ کو امید ہے کہ جو کچھ آپ سے ہو سکے گا، ان کی بہتری کے لئے دریغ نہ فرمائیں گے۔

میر عسکری کل یہاں پہنچ گئے۔ چوتھے کلاس میں داخل ہوئے ہیں۔ بظاہر تو اچھا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ بشرطیکہ پڑھنے میں بھی اچھا ہو۔ فرسٹ کلاس بورڈ ہوا ہے۔ محمد حبیب اللہ خاں کا جلسہ دعوت اخبار میں چھپا ہے، آپ اس کو ملاحظہ فرما دیں گے۔ جس قدر روپیہ آپ کے ذمہ اسکالرشپ وغیرہ کے ہوں، ان کو روانہ فرمائیے۔ والسلام

خاکسار سید احمد، علی گڑھ ۱۸۹۶ء

عزیزی و مکرمی نواب انتصار جنگ بہادر!

آپ کا عنایت نامہ رجسٹری شدہ پہنچا۔ باعث افتخار ہوا۔ آپ کی عادت ہمیشہ بے فائدہ طول نویسی کی ہے۔ اس سبب سے اس خط کو بھی غیر ضروری طول دیا ہے۔ اس لئے میں نے آپ سے یہ خواہش نہیں کی کہ آپ اپنی رائے کے برخلاف رائے دیں۔ بے شک آپ کو کیفیت سے اطلاع نہیں ہے۔ اور اس لئے غلط رائے قائم کی ہے۔ اگر آپ کو کچھ اطلاع ہے، تو اس سے زیادہ اطلاع نہیں ہے۔ جیسے کہ آپ کو شراب اور اس کے نشے سے لفظی اطلاع ہے، اور کیفیت سے اطلاع نہیں۔ پس اگر آپ کو میری دیانت پر جو یہ لفظ جامع جمیع الفاظ ہے۔ طمانیت ہوتی ہے، تو آپ یقین کرتے کہ مشکل مرحلے کے اختیار کرنے کے لئے کوئی ایسا امر درپیش ہے، جس کے سبب یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس امر کے لئے مجبوراً قبول کرنے کو بھی میں نے آپ سے کبھی خواہش نہیں کی۔ جب مجھ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں ہیں، جیسا کہ میں نے خود آپ کو لکھا تھا، تو کوئی توقع برخلاف اس کے اگر میں کرتا، تو میری حماقت تھی۔ میں کسی شخص سے جس نے مخالف رائے دی ہے، رنجیدہ نہیں ہوں: بجز ان لوگوں کے جنہوں نے مخالفت کا طریقہ اختیار کیا۔ ان میں سے میں صرف ان لوگوں سے جن کو مجھ سے بھی کچھ کم ارتباط نہ تھا، اور وہ ناراضی صرف تین شخصوں پر منحصر ہے، مولوی م۔ک۔ خواجہ ی۔م۔ ح۔ ان سے بارہا کہا کہ تمہاری جو رائے ہو، لکھ دو۔ مگر مخالف پارٹی قائم کرنے اور اعلانیہ مخالفت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ کوشش مت کرو، اور اس میں شریک مت ہو۔

جب انہوں نے نہیں مانا، اور کیا جو کچھ کیا، میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ مثل ایسے

شخصوں کے جن سے کوئی خاص دوستی یا راہ و رسم نہ ہو، میں آپ سے ملوں گا۔ آپ کا ادب و تعظیم بجا لاؤں گا۔ مگر مجھ سے اور آپ سے دوستی کی راہ و رسم نہیں ہے۔ میری عادت کسی سے منافقانہ ملنے کی نہیں ہے۔ پس مجھ سے اور آپ سے مطلق دوستی نہیں ہے، اور نہ میں آپ سے دوستی کی راہ و رسم رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے بلاشبہ کوئی کام ایسا نہیں کیا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں ہے، کہ اگر کوئی میرا مخالف ہوتا (نہ مخالف رائے) اور جس کے دل میں نہایت کینہ ہوتا، وہ بھی اس سے زیادہ میری نسبت نہ لکھ سکتا تھا جس قدر آپ نے تحریر فرمایا ہے، صرف میں ہی نہیں، ہر شخص کو تعجب ہے خود ڈپٹی صاحب نے اور مولوی س۔ ح کی پارٹی نے فرمایا کہ سید صاحب مولوی س۔ ح کے چند الفاظ لکھنے سے ناراض ہو گئے تھے۔ مگر مولوی مشتاق حسین نے جو مولوی س۔ ح کے مقابلہ میں بہت زیادہ سخت اور ان کو خود غرض وغیرہ وغیرہ بتایا ہے، تو ان سے کچھ نہیں کہتے۔ روپیہ کے سبب سے اور اس ڈر سے کہ مشتاق حسین جاگیر ضبط نہ کرا دیں، ان کی خوشامد ہی کرتے رہیں گے۔

لعنت اللہ علی الظالم بل علی خیالہم وسوء ظنہم۔ میں خود حیران ہوں کہ آپ کو کس چیز نے برانگیختہ کیا ہے، جو یہ طریقہ اظہار رائے کا اختیار کیا۔ گو تم نے بالکل نیک نیتی برتی ہو، تو وہ معاملہ خدا سے ہے۔ مگر دنیا میں تو کوئی شخص بھی اس کو بجز کینہ کے اظہار کے اور کچھ تصور نہیں کر سکتا۔ خود مولوی س۔ ح نے لوگوں سے کہا تھا کہ جب مشتاق حسین کی واپسی آوے گی، تو حقیقت کھلے گی۔ یہ نہیں معلوم کہ ان کا مقصد میرے حقیقت کھلنے سے تھا، یا آپ کی۔

میں اس بات کو ہرگز دل میں رکھنا نہیں چاہتا، کہ بے شک آپ نے نہایت نامناسب رویہ اختیار کیا۔ اس کا کوئی سبب ہو۔ اگر میں نے ذاتی خط میں مہدی علی کو لکھا تھا کہ تم خط نواب انتصار جنگ کو دکھا دو، یا مولوی س۔ ح کو بھیج دو، تو میری صاف دلی پر دال تھا۔ اس لکھنے سے وہ خط پبلک نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی حق ان کو نہیں تھا کہ اس کو چھاپ کر مشتہر کرتے، اور اس طریقے پر جس سے بعوض اس صاف دلی کے کوئی درجہ میری بدنیتی، بے ایمانی، خود غرضی کا باقی نہیں رہتا۔

آپ کو یہ باتیں اپنی تحریر میں دکھائی نہیں دیتی ہوں گی۔ مگر تمام عالم کو دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی دھمکی نہیں ہے۔ ایک نیچرل اور قدرتی بات ہے، کہ اگر مدرسہ کے کاموں کے انجام میں مجھ سے اس قسم کی مخالفت کی جائے، خود میرا شوق اور میری کوشش اس میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر میں چاہوں بھی تو مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اور اس کا لازمی نتیجہ مدرسہ کی بربادی ہے۔ اگر بدبختی سے امر متنازعہ کی طرف مجادلہ ہو جاتی، تو یقیناً مجھ کو مدرسے سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ میرا دل ہی اس کام پر نہ رہتا۔ بلکہ ایسے واقعات پیش آتے کہ مجھ سے مدرسے کو قائم رکھنا محالات سے ہوتا۔ پس فرض کیجیے کہ ایک طرف تو میری خود غرضی سید محمود کے مقرر کرنے کی تھی، اور ایک طرف مدرسہ کی نفس بربادی تھی۔ جو شخص نہایت ایمانداری سے قوم کا خیر خواہ تھا۔ ان دونوں بلاؤں میں سے کسی بلا کو اختیار کرنا قوم کے حق میں بہتر ہوتا۔ میں کامل یقین کرتا ہوں، اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی۔ قیامت میں خدا کے سامنے رسولؐ کے سامنے کہوں گا کہ اے میرے دادا رسولؐ خدا! میں نے بغیر کسی غرض دینی و دنیوی کے تیری امت کی بھلائی کی کوشش میں نے کوئی درجہ باقی نہیں رکھا تھا۔ جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا۔ من جملہ ان کے ایک یہ نواب انتصار جنگ ہیں۔ آپ کہیے گا کہ میں نے نہایت نیک نیتی سے کیا تھا۔ خدا یقیناً آپ کو معاف کرے گا۔ گو میری اور میرے دادا کی تشفی نہ ہو گی، باشد نہ ہو گی، تم باشد نہ ہو گی۔

یہ میری رائے ہے، آپ کی نسبت اس وقت تک آپ نے جو کیا، مجھ کو یہ یقین ہے کہ آپ نے مولوی س۔ ح کے سبب سے کیا، ورنہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی کینہ دیرینہ نکالا ہے بجز غلطی اور نا عاقبت اندیشی اور غلط فہمیدگی کے اور کوئی سبب نہیں ہے۔ پھر آپ سے ترک ملاقات جب آپ علی گڑھ میں آویں، کیا وجہ؟ اور اگر میرے کلبہ احزاں کو قدوم سے منور کرنا چاہیں، تو مجھے کیوں مضائقہ ہو گا۔ بلکہ خوشی ہو گی۔ بہت سے بہت آپ کی نسبت یہ خیال کر سکتا ہوں کہ بہت سے لوگوں نے دانستہ اور بدنیتی سے مجھے برا بھلا کہا ہے، آپ نے نادانستہ اور نیک نیتی سے۔

میرا کلبۂ احزاں موجود ہے، جب آپ چاہیں، تشریف لاویں، پھر اس خط میں بھی آپ نے بے فائدہ بحث کی ہے۔ میں اس کا کچھ جواب دینا نہیں چاہتا۔ بجز اس کے کہ آپ کی رائے غلط اور آپ کی پیش گوئیاں سب غلط۔ آپ کے خیالات غلط۔ جو کچھ آپ نے فرض کر لیا ہے، سب غلط۔ پھر ان تقریروں کے اعادہ کرنے سے کیا نتیجہ؟ اس واقعہ کی یادگار میں مکان بنانے کی تجویز مجھ کو بھی نہایت پسند ہے۔ آپ ضرور کوشش کیجیے گا امید ہے کہ جو واقعہ ہونا تھا، ہو لیا۔ جو آپ کو کرنا تھا، آپ نے کر لیا۔ اب اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اور اعادہ و معذرت یا دلیل سے قائل یا ساکت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے والسلام

خاکسار سید احمد، علی گڑھ، ۱۰ نومبر ۱۸۸۹ء

مکرمی و مخدومی نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین صاحب!

آداب! آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۱ ستمبر پہنچا۔ ممنون ہوا۔ منی آرڈر مرسلہ پہنچا ہر ایک فنڈ میں جس طرح آپ نے کہا تھا، جمع کیا گیا۔ میرے نزدیک تو خط واپس شدہ کا محفوظ رکھنا ایک رنج کی یادگار کو قائم رکھنا ہے۔ جس کا وجود اور خیال سب معدوم کر دینا چاہیے جب تک میرے دل میں کسی کی طرف سے رنج رہتا ہے۔ تو میں تو اپنے دل کو کفر میں ڈوبا ہوا سمجھتا ہوں۔ اس کا دور کرنا جلد یا بدیر میں اپنے اختیار میں نہیں پاتا۔ الا ہمیشہ اس کے دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے وہ الفاظ اگر تم محفوظ رکھنا چاہتے ہو، تو وہ صرف دال لام ہے۔ میں بھی حتی المقدور اپنے دوستوں کے دو حرفوں کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، اور یہی دو حرف محفوظ رکھنے کے قابل ہیں۔

میں نے آپ کی پنشن کی درخواست "پانیئر" میں پڑھی تھی، مگر میں افواہ بے بنیاد سمجھتا تھا، لیکن آپ کے اس خط سے اس کی تصدیق ہوئی۔ مجھے اس کا نہایت افسوس ہے۔ اور آپ کے اس فعل کو گناہ بھی سمجھتا ہوں۔ اگرچہ مجھ کو یقین ہے کہ سرکار جاہ منظور نہ کریں گے، اور اگر بالفرض منظور کر لیں، تو بھی آپ کو ان جھگڑوں سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا ضابطہ کی رو سے نہ پھنسے، پرائیویٹ طور پر پھنسے۔ پس حرکت بے نتیجہ سے کیا فائدہ؟ اب سنیے، کہ اس حرکت سے آپ کو گناہ کیوں ہوا؟ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ تمام اصلاح ہو جائے، تو آپ رہ سکتے ہیں۔ پس وجہ در حقیقت عدم اصلاح یا توقع عدم اصلاح ہے۔ ایک مسلمانی ریاست ہے۔ جس کی نسبت ایک مسلمان کو باوصف مایوسی اصلاح کے اس کی اصلاح میں کوشش سے باز آنا نہیں چاہیے۔ آپ اس سے باز آتے ہیں۔ اور فی الحقیقت یہ ایک قومی اور اسلامی گناہ ہے۔ رہا وہ جس کو تم نے غلطی سے سمجھا تھا، اور اس غلطی سے در حقیقت قومی گناہ میں پڑے تھے۔ میں قسمیہ آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ مجھے مسلمانوں کی بہتری، ترقی اور درستی، اخلاق کی جس پر میں کوشش کر رہا ہوں، مطلق توقع نہیں ہے، مایوسی محض ہے۔ مگر اس خیال سے کہ ہمارا فرض کوشش کیے جانا ہے، کرتا ہوں۔ پس جس چیز کے حصول سے مایوسی ہو، اس مایوسی کے سبب

سے اپنا فرض کوشش ترک نہیں ہو سکتا۔ پس آپ نے جو اصلاح سے مایوس ہو کے اپنی کوشش کو بند کرنا چاہا، نہایت معصیت کی۔

تمام مسلمانوں پر اس وقت جس قدر عالم دنیا میں ہیں، خدا کی خفگی ہے۔ صاحبان ملک سے اور جو کارکن ان کے ہیں، ان سب میں قوت انتظامیہ معدوم ہو گئی ہے۔ سلطنت کلاں وذی اختیار ترکی، مصر و ایران، بخارا، مراکو، سب کا یکساں حال ہے۔ ہندوستان کی ریاستوں میں حیدر آباد، بھوپال، ٹونک، رامپور، بہاول پور وغیرہ وغیرہ، سب کے سب بدبختی و بد انتظامی و وبال کی حالت میں ہیں۔ ارکین سلطنت میں نفاق، حسد اور عداوت ادنیٰ امر خلاف خواہش پر، اختلاف رائے پر عداوت و دشمنی۔ دوسروں کے منصب و کام میں مداخلت و خلل اندازی، ایک کو ذلیل ثابت کر کر اپنی نام آوری اور خوشی، یہ تمام امور اراکین سلطنت ہائے اسلامی کے امر طبعی ہو گئے ہیں۔ پس کیا ایسی حالت میں اصلاح ہو سکتی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ سب میں یہ باتیں ہیں، اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ میں ان عیوب سے بری ہوں۔ پس کسی اسلامی ریاست میں اصلاح کامل کی یا نیم کامل کی توقع رکھنا خام خیال ہے۔ مگر جو لوگ ان کے کارکن ہیں، ان کو اس مایوسی کے سبب سے دست کش ہونا میں تو گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔

قومی رفاہ کا جو لوگ کام کرتے ہیں، ان کو اس سے بھی زیادہ مزاحمتیں پیش آتی ہیں۔ میں اپنے تئیں سب سے اول ان شخصوں میں سمجھتا ہوں، اور قرار دیتا ہوں کہ قومی کاموں میں بھی لوگوں پر حسد کرتا ہوں۔ خلاف رائے سے ناراض ہوتا ہوں۔ مخالف رائے دینے والوں سے عداوت شروع کرتا ہوں۔ اور تمام الزاموں خود رائی اور نفسانیت وغیرہ کا مرتکب ہوتا ہوں۔ اور باایں ہمہ یہ سمجھتا ہوں، کہ ان تمام برائیوں سے پاک ہوں۔ بہرحال قومی رفاہ کے کاموں میں بھی لوگ (گو وہ میں ہی ہوں) ایسی نالائق باتیں کرتے ہیں۔ پس جب اس وجہ قومی بلکہ اقوی کو اور بہت سے وجوہ ولوازم کے ساتھ شامل کیا جاوے تو قومی رفاہ و اصلاح کی کیا توقع؟

تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں، اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی، وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔ جس کو نہایت سعادت مند سمجھو۔ خیر وہ شیطان معلوم ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ شیطان ہو، یا جس شخص نے اس کو شیطان سمجھا ہے، وہ شیطان ہے۔ ہمارا۔ نہایت حیرت ہے کہ مسلمان مختلف قوم کے مختلف طبائع کے، مختلف ملکوں کے اور مختلف آب و ہوا کے رہنے والے ہیں۔ مگر سب کے سب ایک قسم کی ابتری، خرابی، بد انتظامی، زوال و وبال کی حالت میں ہیں۔ پس کون سا امر سب میں مشترک ہے، جس کے سبب سے سب کی حالت یکساں ہے؟ سر چارلس گریولین کا قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مشترک شے اسلام ہے۔ ترکی کو اس نے یہ نصیحت کی تھی، کہ جب تک اسلام نہ چھوٹے، اصلاح نہیں ہو سکتی۔ کیا کچھ کم افسوس کی بات ہے، کہ حیدر آباد میں تم جیسے اعلیٰ عہدہ دار پانچ چھ اشخاص سے زیادہ نہیں ہیں: اور سب کے سب باہم مخالف، ایک دوسرے کے برخلاف ایک کو دوسرے سے فدیا صاف کہو عداوت، ایک دوسرے پر تفوق چاہنے والا اور ہر ایک شخص یہی کہتا، اور یقین کرتا ہے کہ میرا قصور نہیں، میں تو نہایت نیک ہوں۔ وہ شخص یہ سب عیب رکھتا ہے۔ حیدر آباد بالمقابل دیگر سلطنتوں کے ایک پرکاہ کے برابر ہے، جب اس کے عہدہ داروں کا یہ حال ہے، تو کیا توقع اصلاح ہو سکتی ہے؟

اس سے کچھ بحث نہیں کہ زید قصور وار یا عمرو۔ کوئی ہو۔ نتیجہ واضح ہے۔ تمہارے پنشن سے افسوس اس بات کا ہے، کہ ایک دوست اعلیٰ منصب پر تھا۔ اس سے قبل از وقت علیحدہ ہوتا ہے۔ گو وہ کچھ نہ کرے۔ تب بھی فلاح کے کاموں میں اس سے تقویت ہوتی ہے۔ درحالاں کہ آپ نے قومی کام میں بھی بہت کچھ مدد کی ہے، تو آپ کے علیحدہ ہونے کا زیادہ افسوس ہے۔ ہر پہلو سے تمہاری درخواست پنشن ناواجب اور قبل از وقت ہے خود تم کو اس سے عذر کرنا اور درخواست کو واپس لینا چاہیے اور میں دوستانہ نصیحت کرتا ہوں، کہ اپنے طریقہ کو اور اپنی طبیعت کو بدلنا اور مخالفت کو موافقت سے تبدیل کرنا ضروری ہے، اور جب تک یہ نہ ہوگا، ملک میں انتظام و اصلاح کی توقع خیال خام ہے۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے ناشناخت آپ کو لکھ کر تکلیف دی۔ والسلام۔

خاکسار۔ سید احمد، علی گڑھ، ۱۹؍ستمبر ۱۸۹۰ء

خط بنام وقار الملک بہادر

عزیزی و مکرمی نواب وقار الملک بہادر!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کی عنایت کا کہ آپ نے پانچ روپیہ ماہواری منظور فرمائے، شکر ادا کرتا ہوں۔ مدرسہ پر اس غبن کا ایسا سخت واقعہ ہوا، اور اس نے مجھ کو ایسا سخت صدمہ دیا، جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ مجھ کو سب سے زیادہ تم سے توقع تھی کہ تم آتے اور ہمدردی کرتے۔ نہ صرف مدرسہ کے ساتھ، بلکہ میرے ساتھ، نہ تم آئے، نہ کوئی خط لکھا، نہ بات پوچھی۔ اگرچہ جو ہونا تھا، وہ ہوا۔ اس کا کچھ علاج نہ تھا، مگر تم سے اس رنج میں شریک ہونے کی توقع تھی۔ اس بنا پر میں نے لکھا کہ آپ کو مدرسہ سے ہمدردی مثل سابق نہیں رہی۔ اخراجات کی تنگی سب کو ہے۔ دوسروں کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں، کہ مجھ کو بیس روپیہ دینا کس قدر مشکل ہے۔ پس ایسے ضروری کاموں کے لئے تنگیِ اخراجات کا عذر میں اپنے خیال کے مطابق محض مہمل سمجھتا ہوں۔ پس تم پر کیسی ہی تنگی ہو، اور آمدنی اخراجات کو کافی نہ ہو، اور ہر مہینے قرض ہوتا جاوے۔ ایسے امور میں ان باتوں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتا ہوں دنیا کا کارخانہ اسی طرح لشتم پشتم چلا جاتا ہے بجز ان لوگوں کے جو اپنی زندگی کا مقصود گنج قارون جمع کرنا سمجھتے ہیں۔ اور جس قدر جمع ہو جاوے، بس نہیں کرتے، اور زیادہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، خدا مجھ کو اور تم کو ایسا نہ کرے۔ والسلام۔

خاکسار: سید احمد، علی گڑھ، ۱۳؍نومبر ۱۸۹۵ء

خواجہ الطاف حسین حالی کے نام

جناب مخدوم و مکرم من۔ عنایت نامہ مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہولی، ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اور اب جب ختم ہولی، تو افسوس ہوا، کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے، تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے، کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ، تشبیہات، دور از کار سے جو مایہ ناز شعر و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے، کیونکہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور مؤثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں، جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے، یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے، اس کا شکر ادا کرتا ہوں، اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔

اگریزی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے، تو صرف انہی الفاظ میں ہے، جن میں میری طرف اشارہ ہے بے شک میں اس کا متحرک ہوا، اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ ـــــ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں، اور کچھ نہیں ـــــ خدا آپ کو جزائے خیر دے، اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے. مسجدوں کے اماموں کو چاہیئے، کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں. آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں، اور کیا لاگت لگی ہے، اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے. نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے. یہ بھی لکھیئے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں.

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے، اور رجسٹری کرا دی جاوے، میں دل سے شکر ادا کرتا ہوں. مگر میں نہیں چاہتا کہ مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جائے جس قدر چھپے اور جس قدر مشہور ہو، لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں، اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں. اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی. میرا تو دل چاہتا ہے، کہ دہلی میں ایک مجلس کروں، جس میں تمام اشراف ہوں، اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں. میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا. میرے ان استفسار کا جواب، جن پر نشان درج کر دیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو. والسلام

خاکسار، آپ کا احسان مند تابعدار سید احمد
شملہ پارک ہوٹل، ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء

جناب مولانا مخدوم و مکرم من، مولانا حالی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا، جو ہمدردی آپ نے میرے ساتھ اس روپیہ کے غبن ہونے میں فرمائی ہے، اس کا میں دل سے شکرگزار ہوں. مگر لاکھ روپیہ سے زیادہ غبن معلوم ہوتا ہے. اس کا جس قدر مجھ کو رنج اور صدمہ ہے، وہ بیان نہیں ہو سکتا ہر چند میں دل کو سمجھاتا ہوں، کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا. لیکن ایک نیچرل امر ہے، دل کو بے اختیار رنج و فکر میں پڑنا.

چند روز تک تو میری ایسی حالت خراب تھی، کہ مجھے کسی بیماری شدید کے لاحق ہونے کا اندیشہ رہا. تین روز تک مطلق کھانا کھایا نہیں گیا، اور طبیعت کی عجیب کیفیت تھی. سو اب اس حالت سے بہت افاقہ ہے اگر میرا ذاتی روپیہ ہوتا، تو مجھے کچھ بھی پروا ہوتی. آپ کے کلمات تشفی آمیز سے بہت تقویت ہوئی ہے. مگر جب تعداد کثیر طلبہ کا خیال آجاتا ہے، تو دوسروں کی تشفی سب بھول جاتی ہے خدا رحم کرے. والسلام

خاکسار، سید احمد
علی گڑھ، ۳ر اکتوبر ۱۸۹۵ء

دہلی کا دربار اور اس کا خرچ

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ ۱۰ر نومبر ۱۸۷۶ء)

جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں. کہ گورنمنٹ ہندوستان نے تمام محکموں میں تخفیف کا حکم دیا ہے، تو ہمارے دل میں یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ آج کل خزانہ میں کمی ہے، اور وہ ضرورتیں پیش ہیں، جن کو خزانہ اپنی کمی کے سبب سے برداشت نہیں کر سکتا اور ہم یقین کرتے ہیں کہ جو ارکین تخفیف کی رائے دینے والے ہیں، وہ بھی اپنی رائے کے واسطے بجز اس کے اور کچھ وجہ نہ ظاہر کریں گے کہ خزانہ کم اور ضرورتیں زائد تھیں. اس سبب سے تخفیف کی ضرورت معلوم ہوئی. لیکن بحسب ظاہر جو لوگ اس وجہ کو ضعیف خیال کرتے ہیں، وہ دربار دہلی کے صرف کو دیکھ کر تخفیف کی اس وجہ کو بالکل ناواجب کہتے ہیں، اور وہ بہت حیرت میں ہیں کہ دربار دہلی چھتر لاکھ روپیہ صرف کرے گا. اور گورنمنٹ میں چار ہی لاکھ کی تخفیف کی خواہاں رہے.

اگر تخفیف کی صورت سے قطع نظر کی جاوے، تو بھی ہمارے بعض ہم عصر جو ہندوستان کے خزانہ کا بے دریغ صرف ہونا ناپسند کرتے ہیں. اس چھتر لاکھ روپیہ کے صرف کو بالکل ناواجب کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب ملکہ معظمہ تخت نشین ہوئی تھیں، تو اس وقت صرف مبلغ سات لاکھ روپیہ صرف ہوئے تھے (یعنی ستر ہزار پونڈ) اور اب صرف خطاب شہنشاہی کے قبول کرلے کی خوشی میں چھتر لاکھ صرف کیا جاتا ہے، جو دہ چند سے بھی زیادہ ہوگا. اور ان کو اسی وجہ سے یہ فکر ہے کہ اگر حضور ملکہ معظمہ شہنشاہی تاج پہننے کی رسم ادا فرماویں گی، تو اس عملدرآمد کے لحاظ سے اس وقت بھی ہندوستان سے جو تعلق ہے، انگلستان سے نہیں ہے. پس اس صورت میں یہ تمام بار ہندوستان کے خزانہ پر ہوگا، جس کے لحاظ سے ان کے نزدیک یہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہے، کہ اگر آج ہندوستان کا پارلیمنٹ علیحدہ ہوتا، جیسا کہ انگلستان کا پارلیمنٹ ہے، تو ہرگز چھتر لاکھ روپیہ کی درخواست اس آسانی سے پیش نہ ہوتی. اور اس کی منظوری تو خواب و خیال سے کم نہ ہوتی. اور اب چونکہ انگلستان کی طرح ہندوستان کا پارلیمنٹ اس کے خزانہ کا حامی نہیں ہے اس وجہ سے چھتر لاکھ روپیہ کی رقم کثیر صرف اس نام سے بجٹ میں شامل ہو گی کہ دہلی کے تماشہ میں صرف کی گئی. اور وزیر خزانہ ہند اپنے نقشہ میں اس رقم کو مارچ آئندہ میں لکھیں گے. اور اسی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ سر جان اسٹریچی صاحب بہادر کو آئندہ نہایت دقت پیش آوے گی، کیونکہ ان کو تمام محکموں کی فضول خرچی کا اس کفایت شعاری سے مقابلہ کرنا پڑے گا. اور جس قدر اس باب میں ان کو دقت ہو گی، اس قدر حضور گورنر جنرل بہادر کو نہ ہو گی. کیونکہ وہ کہہ دیں گے کہ یہ تمام صرف ایک بڑی حکمت عملی کے اظہار کے واسطے کیا گیا. اور اس کے ذریعے سے ہندوستان کے تمام شاہزادہ اور رئیس اس لئے بلائے گئے، کہ وہ سب ایک دوسرے کے سامنے اپنے شہنشاہ کی تعظیم و تواضع بڑی عاجزی سے بجا لاویں. اور یہ کہہ کر حضور گورنر جنرل بہادر بالکل بری ہو جاویں گے. حالانکہ ان کے نزدیک دراصل یہ چنداں مفید نہیں ہے. مگر ہم اس رائے سے اس وجہ سے اتفاق نہیں کرتے، کہ جو تدبیر مملکت اس زمانہ میں حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر کو ہندوستان میں کرنی ضرور ہے، وہ زیادہ مفید ہندوستان ہی کے حق میں ہے. اور جو نازک وقت آج کل ہندوستان کی گورنمنٹ کو پیش ہو رہا ہے، اس کا اثر جس قدر ہندوستان کو برداشت کرنا پڑے گا، انگلستان کو برداشت نہ کرنا پڑے گا. پس اس لحاظ سے بلاشبہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو ایک ایسے ہی دربار کی نہایت ضرورت تھی. اور اسی وجہ سے ہم اس چھتر لاکھ روپیہ کی رقم کو صرف دہلی کے تماشے کی رقم نہیں کہہ سکتے، بلکہ اس کو ایک ملکی ضرورت کی رقم کہیں گے. جس میں ہندوستان کے خزانہ کو بخل کرنا سراسر تدبیر مملکت کے خلاف ہوگا. جو لوگ ہندوستان کے خارجی تعلقات کو خوفناک خیال کرتے ہیں، اور جو بڑے زور شور سے آج کل یہ رائے دے رہے ہیں، کہ ہندوستان کی گورنمنٹ کو ایک ایسے زمانے میں جبکہ یورپ کی حالت دگرگوں ہو رہی ہے. اور انگلستان کی گورنمنٹ کو بھی اس عرصہ میں اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ ہندوستان

کی حکومت نہایت پرامن باشوکت رہے۔ تو کیا اب لارڈ لٹن صاحب کا یہ دربار جو ہندوستان کی گورنمنٹ کی قوت اور اطمینان اور شوکت کو ظاہر کرے گا۔ دہلی کے تماشہ کے نام سے موسوم ہونے کے لائق ہوگا۔ ہمارے نزدیک ہرگز نہ ہوگا۔

ہمارا ایک انگریزی معاصر لکھتا ہے، کہ جو رؤسا اور شہزادے اس دربار میں شریک ہوں گے، ان کا صرف زبان سے خیر خواہی کا دم بھرنا حکومت کا استقلال ثابت نہ کرے گا۔ مگر ہماری رائے میں یہ خیال چند وجہ سے قابلِ التفات نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ہم عصر نے اس بات کی کوئی وجہ نہیں لکھی، کہ ہندوستانی شہزادوں اور مہاراجوں کی یہ نیازمندی اور سامنے گورنر جنرل کے حضور میں علی الاعلان جبکہ اپنے اور بیگانہ ملک کے لوگ بھی وہاں حاضر ہوں گے۔ خیر خواہی اور وفاداری کا اقرار کرنا کس وجہ سے صرف زبانی اقرار ہوگا۔ اور کیوں کر اس سے استقلال حکومت ثابت نہ ہوگا۔ علاوہ اس سے اس بات کا بھی کوئی کافی سبب نہیں بیان کیا۔ کہ کیوں ان کے نزدیک اس وقت ایسے دربار کی ضرورت نہ تھی۔

گو یہ مسلم ہے کہ جو تخفیف اس وقت عام محکموں میں کی گئی ہے، وہ اس صرف کثیر کے منافی معلوم ہوتی ہے، مگر جب اس دربار کی قومی ضرورت کو تسلیم کر لیا جاوے اور یہ بھی منجملہ انہیں ضروری اخراجات کے بجٹ میں مندرج ہے، جن سے گورنمنٹ کو کچھ چارہ نہیں ہے، تو پھر ہماری رائے میں یہ صرف کثیر بجائے اس کے کہ تخفیف کے منافی ہو۔ خود تخفیف کی وجوہ میں داخل ہو جاوے گا۔ اور ہم کو یقین ہے کہ ایسے وقت میں کوئی ایسا شخص جس کو روس کے ارادوں اور سرحدی معاملات پر تنظر ہے، ہرگز اس دربار کی ضرورت میں کلام نہ کرے گا۔

ہم اس وجہ کو بھی چنداں پسند نہیں کرتے ہیں کہ ملکہ معظمہ کی تخت نشینی کے زمانہ میں صرف سات لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اب اس قدر کیوں صرف ہوتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو ہمارے نزدیک زمانہ کی تدبیر مملکت اور ملکی مصالحت یکساں نہیں ہوتی۔ تاکہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ جب اس قدر صرف ہوا، تو اب اس قدر نہ ہونا چاہیئے دوسرے یہ کہ وہ خرچ صرف تخت نشینی کی خوشی میں تھا۔ اور اس جشن میں زمانہ کی خوشی اور تدبیر مملکت دونوں شامل ہیں۔ پس کسی طرح وہ قیاس صحیح نہیں ہے۔

ہمارا وہی ہم عصر جس کی یہ رائے ہے کہ استقلال حکومت کچھ زبانی اقرار پر منحصر نہیں ہے۔ اپنی رائے کے اخیر میں لکھتا ہے، کہ دراصل استقلال حکومت اس بات میں ہے کہ کفایت شعاری اور انتظام اور بیدار مغزی ہو۔ اور ان رئیسوں کا دل ان کو راحت پہنچا لے اور ان کے کاموں میں دخیل نہ ہونے سے ہاتھ میں لیا جاوے۔ پس ہم اس کی اس قدر رائے سے بڑی خوشی کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں، اور اس کی اس منصفانہ اور عاقلانہ تجویز سے اس کو بڑی عزت کے لائق سمجھتے ہیں۔

اور ہم بھی یہ رائے تسلیم کرتے ہیں، کہ بلاشبہ رئیسوں بلکہ تمام رعایا کے ساتھ ایسی محبت کا برتاؤ کرنے سے اعلیٰ استقلال حکومت کو حاصل ہوگا۔ اور گورنمنٹ کی یہی تدبیر سچی وفاداری رعایا کے دل میں پیدا کرے گی۔ مگر اپنے ہم عصر موصوف کی اس رائے کو اس محل پر اس وجہ سے تسلیم نہیں کرتے، کہ ہمارے نزدیک یہ دربار کچھ صرف ہندوستانی رؤسا کی گرویدگی کے ہی واسطے نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت خارجی لوگوں پر رعب ڈالنے اور ان کو ہندوستان کی رعایا کی فرماں برداری ظاہر کرنے کے واسطے بھی ہے۔ دراصل یہ ضرورت تمام ضرورتوں سے قوی ہے۔ پس ہم کسی طرح اس ضرورت کو بغیر ایک ایسے دربار کے پیدا ہونا نہیں سمجھتے۔ اور اس کی وجہ سے ضرور ہم شوکت اور قوت کی اعانت سمجھتے ہیں۔ ہاں اگر یہ دربار صرف اس مقصد سے کیا جاتا، کہ گورنمنٹ اس کے ذریعہ سے رعایائے ہندوستان کی وفاداری اور اس کی گرویدگی کو زیادہ کرے۔ تو ہم اپنے ہم عصر کی اس بے نظیر رائے کو آب زر سے لکھتے۔ اور ہم اس کو ضرور تسلیم کرتے، اور اسی وجہ سے ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں، کہ اگر ہمارے ہم عصر کی یہ رائے اس دربار کی مخالفت میں نہ ہوتی، تو ہم اس کے ساتھ نہایت خوشی سے اتفاق کرتے۔ کیونکہ ہم ہمیشہ یہ خیال کرتے ہیں کہ سچی وفاداری اور دلی خیر خواہی رعایا کے دل میں اس وقت پیدا ہو سکتی ہے، جو گورنمنٹ اس کے دل میں محبت کے ذریعے پیدا کر دے۔ اور رعایا کی محبت بغیر اس کے ناممکن ہے، کہ اس کو اپنی گورنمنٹ سے ـــــ وجہ اطمینان ہو۔ اور وہ گورنمنٹ کو اپنا شفیق اور مہربان سمجھ لے ہم خوب جانتے ہیں کہ جو رعایا کسی گورنمنٹ کے جبر سے اور اس کے دباؤ سے اس کی اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کرتی ہے۔ وہ ہرگز وفادار نہیں ہوتی۔ اور جو رعایا گورنمنٹ کی محبت اور شفقت اور مہربانی سے اس کی گرویدہ ہوتی ہے۔ وہ ضرور سچی وفادار ہوتی ہے۔ اور یہ گرویدگی اس وقت ممکن ہے، جبکہ گورنمنٹ اس کے کسی معاملہ میں بہ جبر دخیل نہ ہو۔ اور اس کی جان و حفاظت میں نہایت صفائی کا برتاؤ رکھتی ہو ہم نے اس عرصہ میں جبکہ اس دربار کا اشتہار ہوا تھا۔ اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ حتی الامکان یہ دربار نہایت پرشوکت ہونا چاہیئے۔ اور اب بھی ہم اسی رائے پر اعتماد کرتے ہیں کہ ضرور اس دربار میں گورنمنٹ ہندوستان کو اپنی قوت و حکومت کا دبدبہ دکھلانا چاہیئے۔

اور اس زمانہ میں ہندوستان کے خزانہ کو ذرہ فیاض ہی بننا مناسب ہے۔

اور جو لوگ اس کو صرفہ کی زیادتی سے خوف دلاتے ہیں۔ ان کی رائے کو ہرگز نہیں سننا چاہیئے۔ ہم سرجان اسٹریچی صاحب کے واسطے بھی ان وجوہ پر نظر کرنے سے کچھ دقت نہیں رکھتے۔

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ یکم دسمبر ۱۸۷۶ء)

رہائی

اب یہ خبر پختہ ہو گئی ہے کہ حضور ملکہ معظمہ کے خطاب شہنشاہی قبول کرنے کی خوشی میں بہت سے قیدی ہندوستان کے جیل خانوں سے چھوڑے جاویں گے، جس کی نسبت ہمارا ہم عصر صاحب ماتم دہلی گزٹ اپنا یوں یقین ظاہر کرتا ہے، کہ شاید ان کی تعداد فیصدی دس ہو۔ یہ بات بھی نہایت اچھی ہے کہ جو قیدی بلحاظ چال چلن اپنے کے اچھے ثابت ہوں گے، وہ رہائی کے مستحق ٹھہریں گے۔ دہلی گزٹ کی رائے ہے، کہ اگر ان قیدیوں میں عورتیں زیادہ شامل ہوں جو سوائے قتل عمد کے اور قسم کے جرائم میں ماخوذ ہیں، تو نہایت مناسب ہے۔ پس ہم بھی اس رائے سے نہایت اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں عورتیں باعتبار اپنی اصلی فطرت کے بھی زیادہ رحم کے قابل ثابت ہوتی ہیں۔ اور بسبب اپنے اصلی خلقت کے ان کے جرائم بھی کسی طرح اس تمرد اور بدی پر محمول نہیں ہو سکتے۔ جس پر مرد کے جرائم محمول ہوتے ہیں۔ تکلیف و مصائب کی برداشت کے لحاظ سے بھی ان کا خلقی ضعف ان کا سفارشی ہے۔ پس بلاشبہ یہ رائے نہایت عمدہ ہے، کہ اس شاہانہ بخشش میں عورتوں کو زیادہ بہرہ دیا جاوے اور چونکہ عورتوں کی تعداد بھی جیل خانوں میں نہایت کم ہوگی، اور مردوں کی بہ نسبت وہ بہت کم ماخوذ ہوں گی، اس لئے اس فیصدی تعداد میں اگر ان کی نسبت وسعت زیادہ کر دی جاوے، تو کسی طرح مردوں کے حق میں ناانصافی نہ ہوگی۔ گورنمنٹ کی اس فیاضی سے ہندوستان میں نہایت خوشی ہوگی۔ اور جو ہندوستانی مشرقی سلطنتوں کے قدیمی دستوروں کو دل سے عزیز رکھتے ہیں، وہ حد سے زیادہ خوش ہوں گے۔ اور جس طرح ہندوستان کے خواص اپنے بادشاہ کی وقعت و توقیر اور اس کی فیاضی

سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی طرح عوام بھی یہ بات سمجھ جاویں گے، کہ بلاشبہ ہمارا بادشاہ بڑا فیاض ہے، جس کی فیاضی کا اثر ہم تک پہنچ گیا ہے۔ گو تربیت یافتہ اور حکیم طبیعت ہندوستانی اس کو نہ پسند کرتے ہوں۔

جو مدظلیاں ہماری گورنمنٹ کی اپنی رعایا کی نسبت ہیں، وہ بہ نسبت اس کے نہایت بڑی بڑی ہیں اور اس کا زمانہ تمام مشرقی سلطنتوں کے زمانہ سے بدرجہا فائق ہے۔ اور اس کے عہد کی خوبیوں کی کچھ انتہا نہیں ہے لیکن ان تمام باریک اور مستحکم فیاضیوں کو صرف تعلیم یافتہ ہی ہندوستانی سمجھ سکتے ہیں۔ جو رعایتیں گورنمنٹ اپنی رعایا کے حقوق کی نسبت فرماتی ہیں، اور جو انصاف کا طریقہ اس کی عدالتوں میں رائج ہے، اور جو خوبیاں اس کے قانون کی ہیں، جو امن اس کے عہد میں ہے، جو ترقی تہذیب کی اس کے عہد میں ہے، جو آرام رعایا کو اس کے وقت میں ہے۔ جو تنگی ظالموں کے واسطے اس قانون میں ہے۔ وہ تعلیم یافتہ بخوبی جانتے ہیں، اور اس کی قدر کرتے ہیں۔ مگر ایک عام آدمی جو بازار کا پھرنے والا اور مزدوری کرنے والا ہو۔ وہ اس فیاضی کو سب سے بڑا جانتا ہے، کہ بادشاہ نے مجھ کو قید سے رہا کر دیا۔ یا مجھ کو فلاں کام پر خوش ہو کر یہ چیز انعام میں عطا کی پس ضروری تھا کہ حضور ملکہ معظمہ کے خطاب شہنشاہی قبول کرنے کی خوشی میں وہ شاہانہ فیاضی بھی ظاہر کی جاتی جس سے عوام الناس بھی جانیں کہ ہمارے بادشاہ نے یہ احسان کیا۔

ہم جانتے ہیں کہ اس لحاظ سے بھی یہ طریقہ پسندیدہ ہے، کہ ہمارے حضور گورنر جنرل بہادر یہ دربار ایسے مقام پر بیٹھ کر فرماویں گے جہاں شہنشاہان ہندوستان کا تخت تھا اور اس لئے تالیف قلوب کے واسطے بھی ایک ایسی رسم کا کرنا مناسب تھا، جس سے ہندوستانیوں کے دلوں کو مناسبت ہو۔ اور وہ اس سے خوش ہوں، غرض کہ بہر کیف اس خوشی میں قیدیوں کی رہائی نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ اور ہم خیال کرتے ہیں کہ جو لوگ اس بات کا اندیشہ کرتے تھے، کہ قیدی رہا ہو گئے تو ہماری کوٹھیوں کے احاطے میں چوری کریں گے، اور ہمارے مال کی محافظت میں نقصان ہوگا۔ ان کو اس بات سے اطمینان کر لینا چاہئیے کہ نیک چلن چور چھوٹیں گے، بد چلن نہیں چھوٹیں گے، جو ہم کو اندیشہ ہو۔ اور علاوہ اس کے یہ فیصدی دس کہاں تک پھیلیں گے۔ جو اس قدر چوریاں کریں گے شاید ایسے خیال کے لوگوں کو گوارا نہیں ہے، کہ کسی پر رحم کیا جاوے۔

جیل خانوں کی رپورٹ

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۲۰ر اکتوبر ۱۸۷۶ء)

ہم ہمیشہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں، کہ ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی ہندوستانیوں کا خوش اقبالی کا نشان ہے۔ اور اس کا قانون اور منشاء قانون انصاف کا حامی اور عقل کے موافق ہے، جس کے سبب سے رعایا ان تمام حقوق اور رعایتوں کی مستحق ہو سکتی ہے، جو ایک عادل اور منصف گورنمنٹ کی مکمل حفاظت میں ہونی چاہئیے۔ لیکن بایں ہمہ ہم کو کبھی کبھی یہ کہنا پڑتا ہے، کہ فلاں شخص کے معاملہ میں انصاف نہیں ہوا، اور فلاں معاملہ میں ہندوستانیوں کے حق پر نظر نہیں ہوئی۔ لیکن تاہم ہماری یہ رائے کبھی یہ ثابت نہیں کرتی، کہ اس بے انصافی کا سبب اصل قانون ہوا ہے۔ بلکہ ہم اس کو ہمیشہ خاص افسروں کی غفلت یا بے پروائی کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ اگر وہ افسر احتیاط کریں، اور گورنمنٹ کے انصاف کی پوری تعمیل کریں تو ہرگز ہم کو اس شکایت کا موقعہ نہ ملے۔ اور بلاشبہ اس میں ذرہ تردد نہیں ہے۔

کہ ان افسروں کی احتیاط اس وقت ظہور میں آ سکتی ہے، جبکہ حکام بالا دست اپنے ذمہ یہ بات فرض سمجھیں کہ وقتاً فوقتاً ان افسروں کی بے جا اعتدالیوں پر تنبیہہ و مواخذہ کرتے رہیں، اور اگر وہ حکام عالی مقام ہی اس میں چشم پوشی کریں گے، تو پھر وہ افسر احتیاط کو عمل میں نہیں لاویں گے۔ اور وہ اپنے اختیارات کو محدود نہیں سمجھیں گے۔ اور اس وجہ سے گورنمنٹ کے اس قانون کی پوری تعمیل نہ ہوگی۔ اور ہندوستانیوں کی زبان شکایت کو کوئی تدبیر نہ روک سکے گی۔ حقیقتہ شکایت کا منشاء عامہ رعایا کی جانب سے یا کوئی حق تلفی ہوتی ہے یا کوئی ایذا و تکلیف ہوتی ہے، اور جس حالت میں کہ بعض افسروں کے وہ اختیارات جو ان کے عہدہ سے زیادہ ہوں، یا قانون کی حد سے باہر ہوں، رعایا کو تکلیف پہنچاویں گے۔ تو صرف گورنمنٹ کے قانون کی خوبی اور عمدگی کچھ رعایا کی زبان شکایت کو بند نہ کر دے گی، ہاں البتہ ایسی حالت میں اصل قانون یا منشاء قانون کی شکایت جائز نہ ہوگی، اور ہم یقین کرتے ہیں کہ ایسی شکایت بجز ان عوام الناس کے جو قانون کو نہیں جانتے، خواص سے کبھی ظہور میں نہ آوے گی۔ پس ایسی حالت میں حکام بالا دست پر بلاشبہ واجب ہے، کہ اپنے ماتحت افسروں کی کارروائیوں کو نظر غور سے دیکھتے رہیں۔ اور اس بات پر نظر رکھیں کہ وہ اپنے حد اختیارات سے باہر نکل کر کام کرنا چاہتے ہیں، یا نہیں۔

ہم اس وقت اس رپورٹ کو دیکھ رہے ہیں، جو گزشتہ سنہ کی بابت شمال مغربی جیل خانوں کے متعلق ہے۔ اس رپورٹ میں نہایت ایمانداری اور بڑی سچائی کے ساتھ یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ۱۸۷۵ء میں قیدیوں کی زیادتی کا یہ باعث بھی تھا، کہ مجسٹریٹوں نے ان لوگوں کو بھی جیل خانہ دکھلایا۔ جن سے کوئی خاص جرم وقوع میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ صرف یہ بات تھی کہ وہ بے چارے اپنی نیک چلنی کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے، اس کے بعد اسی رپورٹ میں یہ فقرہ مندرج ہے کہ سر جارج کوپر صاحب یہ رائے دیتے ہیں، کہ یہ اختیار جس وسعت کے ساتھ عملدر آمد میں لایا جاتا ہے، اس کا تو دار و مدار مجسٹریٹ کے ذاتی خیال پر ہے۔ اور یہ وہ اختیار ہے، کہ جس کے عملدر آمد پر افسران بالا کو اچھی طرح نظر رکھنا چاہئیے۔ کیونکہ ایک کم عقل اور بے احتیاط حاکم کے ہاتھ میں ایسے اختیار کا ہونا ظلم کا ایک خطرناک ہتھیار ہے۔ پس ہم کو دیکھنا چاہئیے کہ سر جارج کوپر صاحب بہادر کی یہ عاقلانہ رائے کہاں تک ہماری رائے کو تقویت دیتی ہے اور کہاں تک ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہوتا ہے، کہ جہاں تک ہندوستان میں نا انصافی کی شکایت ہے۔ وہ بعض تند مزاج اور ناواقف نوعمر حکام کی اس بے اعتدالی پر مبنی ہے، جو وہ اپنی حد اختیار سے زیادہ عمل میں لاتے ہیں۔ اور قانوناً اس کے مجاز نہیں ہوتے۔ دیکھو۔ اگر حضور سر جارج کوپر صاحب بہادر کی یہ رائے صحیح ہے (اور بلاشبہ صحیح ہے) کہ قیدیوں کی تعداد کی زیادتی بعض مجسٹریٹوں کی اس کارروائی پر مبنی تھی کہ انہوں نے غیر مجرموں کو جیل خانہ میں بھیج دیا، تو شاید ہندوستانیوں کا یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا، کہ جو انصاف گورنمنٹ کے قانون میں ہے، وہ اس کی عدالتوں میں نہیں ہے۔ اور جو انصاف و احسان قوانین کے دل و زبان میں ہے، اس کا ظہور ان لوگوں کی کارروائی سے نہیں ہوتا، جو اس کے عملدر آمد کے ذمہ وار ہیں۔ ہر ضلع کا مجسٹریٹ اپنے ضلع میں ایک ایسا بادشاہ ہوتا ہے، کہ اس کا حکم گورنمنٹ کے حکم سے سابق ہوتا ہے۔ اور گورنمنٹ کا کوئی حکم بغیر اس کی مداخلت کے نہیں نافذ ہوتا۔ پس اگر ایسے ذی اختیار شخص کو اپنے اختیارات کے عملدر آمد میں حد قانون کی پابندی نہ ہو۔ اور اس کو کسی قسم کی باز پرس کی پرواہ نہ ہو، تو اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں ہو سکتا، کہ یہ اختیار ایک بہت

بڑے ظلم کا نشانہ ہوگا۔ اور ایسے تیر کے نشانہ کے سامنے رعایا کے جان و مال کی حفاظت کی امید نہایت امر موہوم ہو گی، جس کے سبب سے رعایا ہرگز امن و اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی بسر نہ کر سکے گی۔ بلکہ ہمیشہ ایک خوف و اندیشہ کی حالت میں زندگی بسر کرے گی کیا ایک شریف رعایا کو اس سے زیادہ کسی بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ضلع کا حاکم بغیر کسی قانونی جرم کے اس کو جیل خانہ دکھلا سکے۔ اور بغیر کسی قصور کے اس کی آبرو کو خراب کر سکے۔ کیا جس حالت میں ایک ضلع کا مجسٹریٹ کسی شریف آدمی کو صرف اس قصور پر ماخوذ کر سکے کہ اس نے ہم کو راستہ میں سلام نہیں کیا۔ یا اس نے ہم کو دیکھ کر سواری سے اترنا نہیں چاہا۔ یا اس نے سڑک پر ہماری برابر بگھی چلائی، تو کیا ایسے ضلع میں امن ہو سکتا ہے۔ اور رعایا خیال کر سکتی ہے، کہ ہمارے حقوق محفوظ ہیں۔ اور ہم ایک نہایت خوش فضا قانون کے باغ میں دم لے رہے ہیں۔ اور کوئی چیز ہمارے سانس کو نہیں روکتی، ہماری راستے میں ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لحاظ سے ہمارے حکام عالی مقام کا فرض ہے کہ وہ ماتحت افسروں کی ایسی حرکتوں کو دیکھتے رہیں۔ ہم اسی وجہ سے مدح کرتے ہیں۔ اس بات کی کہ فلر صاحب کے مقدمہ میں حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر کی کارروائی نہایت عمدہ اور ایسے ٹھیک وقت پر ہوئی، جبکہ اس کی نہایت ضرورت تھی۔ اگر حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر کی مانند یہ تنبیہ پہلے سے ہوتی تو اضلاع شمالی کا ایک مجسٹریٹ اپنی عدالت میں ایک ہندوستانی وکیل کے سر پر اس جرم میں جوتیاں نہ رکھواتا۔ کہ وہ عدالت میں اس کمرہ کے اندر جوتا پہنے چلا آیا۔ جس میں صاحب مجسٹریٹ بہادر کی عدالت کا کٹہرہ تھا۔

اس رپورٹ میں ان اختیارات کا بھی ذکر ہے، جو صاحبان سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ قیدیوں کی سزا کے متعلق عمل میں لاتے ہیں۔ اور اس کی نسبت یہ بیان کیا گیا ہے، کہ صاحبان سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ اس باب میں متفق نہیں ہیں، بلکہ ہر ایک جرم کی نسبت ہر ایک کی رائے مختلف ہے۔ اور اس کی نظیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض سپرنٹنڈنٹ قیدیوں کے پاس تمباکو کا نکلنا قتل عمد کی حد سے کچھ ہی کم سمجھتے ہیں۔ اور بعض اس کو نہایت خفیف اور بعض بالکل جرم ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ اس قباحت کے رفع کرنے کے واسطے حضور سر جارج کوپر صاحب بہادر یہ تجویز فرماتے ہیں کہ جرموں کے درجہ مقرر کئے جاویں۔ اور ان کی سزا متعین کر دی جاوے۔ صرف اس کا تصفیہ صاحبان سپرنٹنڈنٹ کی رائے پر چھوڑ دیا جاوے۔ پس ہم سر جارج کوپر صاحب کی اس تجویز کو نہایت عمدہ سمجھتے ہیں۔ اور ہم کو امید ہے کہ جو اندھیر بغیر کسی قاعدہ کے ہوتا ہے، وہ ضرور اس تجویز سے کم ہو جائے گا۔ گو یہ تجویز اس اختیار کو نہ روک سکے گی۔ جو باوجود ضبطِ قانون کے بھی بعض حکام اپنے ذاتی خیال سے عمل میں لاتے ہیں۔ چنانچہ حضور ممدوح خود ہی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، کہ بعض مجسٹریٹوں نے قیدیوں کے جیل خانہ بھیجنے میں اپنے ذاتی خیال کی پابندی کی۔ پس اسی طرح سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ بھی باوجود حد اختیار کے کسی اپنے ذاتی خیال کا پابند ہو سکتا ہے۔ اور اس کی بابت تدبیر ہماری دانست میں کسی جدید قانون کی تجویز سے ایسی ممکن نہیں ہے، جس قدر کہ حکام بالا دست کی تنبیہ سے متصور ہے۔ جیل خانہ میں بعض نیک چلن قیدیوں کی سزا میں کبھی کمی کرنے کا قاعدہ مفید بیان کیا گیا ہے۔ اور اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں ہے کہ وہ ضرور مفید ہے۔ اور ایک ایسے شخص کو جو اپنے جرم کے سبب سے جیل خانے میں آیا ہے، نہایت بڑی نیک چلنی کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر یہ بات نہایت سچ ہے کہ یہ ترغیب صرف انہیں مجرموں کو ہو سکتی ہے، جو اپنے کسی اتفاقیہ جرم سے قید ہو گئے ہیں۔ اور جو مجرم جرم کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور جن کو کسی نوع کا پاس عزت نہیں رہا۔ ان کے حق میں یہ تدبیر مفید نہیں ہے۔ پس اس لحاظ سے حضور سر جان اسٹریچی صاحب بہادر کی یہ رائے نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ سزا کی تخفیف یا اور کسی قسم کی رعایت کا طریقہ صرف انہیں قیدیوں کے واسطے مناسب ہے، جو ہمیشہ جرم کے عادی نہیں ہیں۔

ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جیل خانوں کے سپرنٹنڈنٹوں کے اختیارات اور آزادی میں خلل ڈالنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ بہ نسبت اور افسروں کے وہ ایک سخت اور خطرناک انتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ کے زیر حفاظت ایک بڑا بھاری گروہ ان بدمعاشوں کا ہوتا ہے۔ جو تمام ضلع کے بدمعاشوں کے انتخاب ہوتے ہیں۔ اور اب جہاں تک جیل خانوں میں آسائش کے قواعد زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور جیل خانہ کے اندر قیدی آزاد ہوتے جاتے ہیں۔ اور سوائے ایک خاص قسم کے قیدیوں کے بیڑیوں وغیرہ سے خالی رہتے ہیں۔ اسی قدر جیل خانوں میں خطرہ زیادہ ہوتا جاتا ہے پس اب اگر ایسے گروہ کے محافظ کے اختیارات میں خلل ڈالا جاوے، تو بلاشبہ انتظام میں رخنہ ہوگا۔ اور ہمیشہ ایک اندیشہ رہے گا۔ مگر جس طرح ہم اس قدر آزادی کے موید ہیں، جو اس انتظام کے واسطے کافی ہو، اسی قدر اس آزادی کے مخالف ہیں، جس سے صاحبان سپرنٹنڈنٹوں کو قیدیوں کے ساتھ اس قسم کے سلوک کرنے کا اختیار حاصل ہو جاوے، جو ایک انسان کیا معنی ایک ذی روح کے بالکل مناسب حال نہ ہو۔ جیل خانہ مجرم کی ہمت اور اس کے جرم کی قوت اور اس کے دلی جوش اور طراری کے کم کرنے کا ذریعہ ہے۔ کچھ مجرم کی روح کے فنا کرنے اور اس کی جسمانی اور روحانی تندرستی کے ضائع کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ پس جو عملدرآمد قیدیوں کی روح اور ان کی صحت کو فنا کرے، وہ ضرور سپرنٹنڈنٹوں کے اختیار سے باہر ہونا چاہیئے۔ اور ہمیشہ اس باب میں ان کے اختیارات کی ایک حد ہونی چاہیئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ارباب فہم ہمیشہ قیدیوں کے حق میں اس رعایت کی درخواست کرتے ہیں، جو ان کے واسطے کسی طرح مناسب نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح بعض ارباب اس ظلم اور شدت کی درخواست کرتے ہیں، جو انسان کے واسطے عقلاً جائز نہیں ہے۔ مگر ہم ہمیشہ ان دونوں رایوں کے مخالف رہے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بے جا رعایت کے سبب سے سزا سزا نہیں رہتی۔ اور بے انتہا شدت کے سبب سے سزا ظلم ہو جاتی ہے۔ ہم اس رائے کو نہایت ہی پسند کرتے ہیں، کہ قیدی کو بجائے اس کے کہ ایک بار کسی جرم پر تیس بید لگائے جاویں، بہت بہتر ہے، کہ چار پانچ بار اس کو یہ سزا دی جائے۔ کیونکہ تقسیم سزا سے اس کی روح اور جسم پر ناواجب صدمہ نہ پہنچے گا۔ اور ایک سپرنٹنڈنٹ کو اس طریقہ سے چند بار اپنے اختیار کے عمل میں لانے کا موقع ملے گا۔

ہم نہایت خوش ہیں، اور نہایت شکر گزار ہیں، حضور سر جارج کوپر صاحب بہادر کی ان منصفانہ رایوں کے جو حضور ممدوح نے اس رپورٹ میں ظاہر فرمائی ہیں، اور ہم کو امید ہے کہ حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر اور حضور سر جارج کوپر صاحب بہادر کی وہ توجہ جو انہوں نے ہندوستانیوں کی حالت اور افسروں کے عملدرآمد کی نسبت فرمائی ہے۔ ہندوستان میں نہایت انصاف پھیلا دے گی۔ اور گورنمنٹ انگریزی کے عادلانہ قانون کی وقعت رعایا میں بٹھلا دے گی۔ اور جس طرح حضور لارڈ لٹن صاحب

کی اس کے قبول تنبیہ نے ہندوستان کی تمام عدالتوں کو فائدہ پہنچایا اسی طرح مسٹر جارج کوپر صاحب بہادر کی یہ منصفانہ تعریفیں صاحبان مجسٹریٹ اور نیز جیل خانوں کے ان سپرنٹنڈنٹوں کو متنبہ کرے گی، جو ایک چلم تمباکو کو قتل عمد کے قریب قریب سمجھ کر نہایت بے رحمی سے قیدیوں کو سزا دیتے تھے۔ اور جو رحم انسانی ہمدردی کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ اس کو کام میں نہیں لاتے تھے۔ اور اس قسم کی تنبیہیں انصاف کی ترقی میں اس قدر فائدہ بخشیں گی، کہ اس قدر چند جدید قانون ہرگز نہ بخشتے کیونکہ ہماری رائے میں زیادتی قانون ہمیشہ معاملات کی پیچیدگی کو بڑھاتی ہے۔ اور حکام بالا دست کی نگرانی فوراً ایک کام کو اپنے موقع پر پورا کر دیتی ہے۔

عدالت ہائے سرکاری کی تخفیف

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڈھ ۲۲ ستمبر ۱۸۷۶ء)

آج کل سرکاری عدالتوں میں تخفیف کی خبر گرم ہونے سے ایک عجیب کھلبلی پڑی ہوئی ہے، اور جو شخص ہے، اسی فکر میں مبتلا ہے۔ جو لوگ معرض تخفیف ہیں، ان کو اس بات کا خیال ہے کہ اول تو روزگار ہاتھ سے جاتا ہے، دوسرے وہ تمام استحقاق جو مدتوں جان مار کر اور اپنا اچھا وقت سرکاری ملازمت میں گزران کر پیدا کیا تھا، ہاتھ سے جاتا ہے۔ اور بہت سوں کو یہ فکر ہے کہ اب آئندہ بوڑھی عمر میں نوکری کے تو لائق نہیں ہیں، دیکھئے عمر کس مصیبت میں کٹے گی۔ اور کس ذلت سے زندگی بسر ہوگی۔ اور بہت سے ایسے لوگ جو تخفیف کے دغدغہ سے ایمن ہیں۔ ایسی فکر میں سرشار ہیں، کہ جب تخفیف ہوگی، اور ملازم کارکن کم ہو جاویں گے۔ اور کام عدالتوں کا بدستور رہے گا۔ تو بہر کیف انہیں عدالتوں میں انہیں باقی ماندہ ملازموں سے وہ کام پورا کرایا جاوے گا۔ کیونکہ اس کا سرانجام بجز اس کے اور کسی طرح ہو سکتا ہے، کہ جو شخص موقوف ہو، اس کا کام اوروں پر منقسم ہو جاوے اور یہی باقی ماندہ لوگ اس کے کفیل ہوں۔ پس ایک تو پہلے ہی سے ہم لوگ مر رہے ہیں کہ کام حد سے زیادہ ہے، نہایت مشکل اور بڑی بڑی مصیبتوں سے پورا ہوتا ہے۔ صبح سے آتے ہیں، شام کو جاتے ہیں، نہ کھانے کی خبر ہے، نہ پہننے کی خبر ہے بستہ سامنے رکھا ہے، دوات قلم سے باتیں ہو رہی ہیں۔ نہ تعطیل کی خبر ہے، نہ رخصت کا خیال۔ نہ چھٹی کا ذکر ہے، صرف کام ہی کام یاد ہے، اور جب تخفیف شدہ ملازموں کا کام بھی ہمارے سر آ پڑا ہے، تو دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ جرمانوں ہی کے مارے کام تمام ہو جاوے گا، اور کام پورا نہ ہوگا۔ یا گورنمنٹ کے نزدیک نالائق ٹھہریں گے۔ یا خود دق ہو کر نوکری چھوڑ دیں گے۔ غرض کہ جو لوگ تخفیف کے لائق ہیں، وہ بھی اور جو تخفیف سے بچے ہوئے ہیں، وہ بھی دونوں مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ تخفیف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چاندی کا نرخ گھٹ گیا ہے۔ روپیہ کی ضرورتیں پیش ہیں۔ آمدنی بدستور خود ہے، پھر تخفیف نہ ہو، تو کیا ہو۔ مگر ہم کو حیرانی یہ ہے کہ اس قسم کی تخفیف سے جو سر دست گورنمنٹ نے تجویز فرمائی ہیں، نتیجہ کیا ہوگا۔ کیا گورنمنٹ کی کچہریوں میں دو چار چپڑاسیوں اور دو چار پہلے محرروں اور دو چار بستہ برداروں ایک دو دفتریوں اور بڑے سے بڑے ایک دو زائد پیش کاروں کی تخفیف سے کوئی ایسا معتدبہ خزانہ جمع ہو جاوے گا، جو قابل اعتبار ہو۔ یا اس کے سبب سے کوئی بڑا خرچ موقوف ہو جاوے گا۔ جس کی گورنمنٹ برداشت نہیں کر سکتی۔ یا دس بیس چوکیداروں کے موقوف کرنے سے گورنمنٹ کچھ کام چلا سکتی ہے، جہاں پر نظر ہو۔ ہماری دانست میں ایسے لوگوں کی تخفیف سے سوائے واویلا اور فریاد کے پیدا ہونے کے اور کوئی نتیجہ نہیں معلوم ہوتا۔ اور ایسے لوگوں کی تخفیف سے علاوہ فریاد کے انتظام کی ابتری کا بڑا اندیشہ ہے۔ اگر بجائے دس چپڑاسیوں کے آٹھ تجویز ہوں گے، تو سوائے اس کے اور کیا ہوگا، کہ دس کا کام آٹھ کو کرنا پڑے گا، اور اس کے سبب سے جو کام جلد ہوتا تھا، وہ دیر میں ہوگا۔ اگر دس محرروں میں دو کم ہو جاویں گے، تو جو کام ایک گھنٹہ میں ہوتا تھا وہ سوا گھنٹہ میں ہوگا۔ اگر پیشی کے اہل کار کم ہو جاویں گے، تو اسی قدر حکام کی دقتیں بڑھ جاویں گی۔ اور جس اطمینان سے اس وقت کام چل رہا ہے، وہ نہ رہے گا۔ حکام کی محنتیں زیادہ ہو جاویں گی۔ غرض کہ اس وقت سوائے اس کے کہ ایسی تخفیف سے مصیبت زیادہ ہو۔ اور کچھ سود معلوم نہیں ہوتا۔

ہم حیران ہیں کہ گورنمنٹ کی نظر ایسی تخفیف پر کس غرض سے ہے۔ اگر وہ تخفیف ہی کرنا چاہتی ہے، تو ایسا کیوں نہیں کرتی، کہ جو ضلع قریب قریب ہیں، ان میں سے جس ضلع کو چھوٹا خیال کرے۔ اس کو توڑ کر اور بڑے ضلعوں میں شامل کر دے۔ اور اس تدبیر سے لاکھوں روپیہ کی بچت حاصل کرے۔ اور اگر ضلعوں کے توڑنے میں دقت معلوم ہو، تو جو لوگ بڑے بڑے تنخواہ دار ہیں، ان کی تنخواہوں میں سے ایک معتدبہ حصہ کی تخفیف کر دے۔ تاکہ جو انتظام ہے، وہ بجنسہ باقی رہے۔ اور کسی طرح کا ہرج بھی نہ ہو۔ اور تخفیف بھی ہو جائے۔ جو افسر اس وقت دو دو ہزار اور چار چار ہزار تنخواہ پاتے ہیں۔ اگر ان کی تنخواہوں میں سے دو دو سو چار چار سو کی تخفیف ہو جائے تو دو ہی افسروں کی تنخواہ کی تخفیف سے اس قدر بچت ہوگی، کہ پچاس محرروں کی تخفیف سے اس قدر نہ ہوگی۔ اور کام بدستور چلے گا۔

گو ہم یہ نہیں کہہ سکتے، کہ حاکم عدالت اور پیش کار عدالت کا کام کچھ باہم مقابلہ کرنے کے لائق ہے۔ جس کے سبب سے ہم یہ کہہ سکیں کہ پیش کار کام حد سے زیادہ کرتا ہے اور تنخواہ صرف سو سوا سو روپیہ پاتا ہے، اور حاکم کام تھوڑا کرتے ہیں، اور تنخواہیں زیادہ پاتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہرگز ایک حاکم کا کام ایک سررشتہ دار کے کام سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا۔ لیکن تاہم ان کی تنخواہوں میں سے سو دو سو روپیہ کا کم ہو جانا کچھ مخل مطلب نہیں ہو سکتا۔ پس نہایت مناسب ہو کہ ہماری بیدار مغز گورنمنٹ غریبوں کی تخفیف سے باز رہے۔ اور بجائے اس کے مذکورہ بالا دونوں تدبیروں میں سے ایک کو اختیار کرے۔

ہماری گورنمنٹ اس بات پر بھی نظر فرماوے، کہ اب پولیس کے سررشتہ کی بدولت کیا صرف ہوتا ہے۔ اور پہلے کیا صرف ہوتا تھا۔ اور انتظام کے لحاظ سے پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔ پہلے دو دو سو روپیہ کے تھانیدار اور ہزار ہزار پانسو کے سپرنٹنڈنٹ کہاں تھے۔ اور اس قدر صرف کی کب ضرورت تھی۔ اور اب تو کچھ ٹھکانا نہیں ہے۔ پس اگر گورنمنٹ تخفیف کی ہی خواستگار ہے، تو پولیس کی طرف سے کیوں نہیں متوجہ ہوتی۔ اور بڑے بڑے یورپین صاحب کیوں معرض تخفیف میں نہیں آتے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اب پولیس کے انتظام کا انقلاب ہو گیا ہے۔ اور افسران پولیس کی ذمہ داری بہت کم ہو گئی ہے، اور ان کا کام بہت کم ہو گیا ہے۔ اور پولیس کی تخفیف سے بھی ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ بے چارے کانسٹیبل جو تنخواہ پانچ سات پاتے ہیں۔ اور وقت اور محنت میں

سپرنٹنڈنٹ صاحب سے زیادہ مبتلا رہتے ہیں، ان کی تخفیف کی جاوے۔ بلکہ تخفیف انہیں کی کی جاوے۔ جو بیکار بیٹھے ہوئے پنشن پاتے ہیں، کیونکہ کانسٹیبلوں اور محرروں کی تخفیف سے تو کام میں سراسر ہرج ہو جاوے گا۔ اور بجائے چار فضول افسروں کے ایک افسر کی کمی سے کچھ ہرج نہ ہوگا۔

ہماری گورنمنٹ کو معلوم ہے کہ پہلے ہی تھانیدار اور برقنداز تھے، اور رعیت کی حفاظت کا کام بڑی آسانی سے چلتا تھا۔ اور تنخواہیں ان کی بہ نسبت اس زمانے کے نہایت کم تھیں۔ اور اب تنخواہیں اور افسر جس قدر زیادہ ہو گئے ہیں، اسی قدر کام میں ابتری زیادہ ہے۔ پس بلاشبہ تخفیف کی گنجائش پولیس کے انتظام میں بہت ہے اور اس قدر بڑی بڑی تنخواہوں سے یورپین افسر کچھ ضرور نہیں ہیں، کچھ ان کی تعداد کم ہونی چاہیئے، اور کچھ تنخواہوں میں کمی ہونی چاہیئے۔

سررشتہ تعمیرات سرکار بھی اور محکموں کی بہ نسبت زیادہ نگرانی کے لائق ہے۔ اور اس کے مصارف کی کمی سے بھی بہت کام نکل سکتا ہے۔ پس اگر بجائے ایسے موقعوں کی تخفیف کے صرف چند چپڑاسی اور محرروں اور پیش کاروں کی تخفیف کی جاوے، تو بڑے افسوس کے لائق بات ہوگی۔

گورنمنٹ سے یہ امر بھی نہایت بعید ہے، کہ جب وہ کسی قسم کی تخفیف تجویز کرتی ہے، تو پہلے سے یہ تجویز نہیں فرماتی کہ جو لوگ بلاقصور و بلاجرم تخفیف میں آکر اپنے تمام حقوق ملازمت سے محروم ہوں گے، تو ان کی حق تلفی کی کیا تلافی ہوگی ہماری دانست میں جو لوگ پوری پنشن کے مستحق ہو چکے ہیں۔ صرف تھوڑی سی کمی باقی ہے، تو بلاشبہ ان کو پنشن ملنی چاہیئے۔ اور جو لوگ پوری پنشن کے مستحق نہیں ہیں ان کے استحقاق پر نظر کرنے سے ان کو اور سرکاری سررشتوں میں جو تخفیف سے محفوظ رہے ہیں، بھرنا چاہیئے، تاکہ وہ لوگ بالکل محروم نہ کئے جاویں۔ اور اگر ان کے واسطے کچھ نہ ہوگا، تو ہماری گورنمنٹ کیوں کر اس بات کو تجویز فرماوے گی، کہ صدہا بندگان خدا ایک بلائے ناگہانی میں آجاویں گے، اور کسی قصور میں ملزم نہ ہونگے جس بارے میں ہماری مذکورہ بالا رائے ہے۔ اس کے متعلق مندرجہ ذیل آرٹیکل پڑھنے کے لائق ہے۔ جس کو ہم نورالابصار سے نقل کرتے ہیں۔

سرکار دولت مدار کے خزانہ میں ٹوٹا پڑے، تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ اگر سمندر سوکھ جاوے، تو ندی نالوں کی کیا گنتی ہے۔ لیکن جبکہ حقیقت میں یہ حال ہے، تو البتہ سرکار کو اس ٹوٹے کی تدابیر کرنی ضرور ہے۔ اور تدبیر اس کی دو طرح سے ہو سکتی ہے، یا آمد بڑھے، یا خرچ گھٹے۔ آمد کا بڑھنا تو ٹیکس اور مال گزاری وغیرہ سے ہے۔ سو مال گزاری تو اس حد تک پہنچی ہے، کہ زمین داروں پر اس کا بڑھانا دشوار ہے، بلکہ اندیشہ ہوتا ہے، کہ کہیں کہیں سرکار کو گھٹانی پڑے گی، اور ٹیکس کی آزمائش انکم ٹیکس سے ہو چکی ہے، کہ دو چار سال میں خلقت نے تنگ ہو کر اس قدر شور و غل کیا جس سے آخر کو وہ ٹیکس موقوف کرنا پڑا۔ اس طرح دروازے آمد کے تو بند ہیں۔ اب رہی تخفیف سو اس کی طرف سرکار فیض آثار نے رجوع کی ہے۔ خبر ہے کہ ہر سردفتر کے نام بہت تاکیدی حکم اس بات کے جاری ہوئے ہیں، کہ جس طرح بنے، عملہ کی تخفیف کرو۔ اور جو تم نہ کرو گے تو گورنمنٹ یہ کام اپنے ہاتھ میں لے گی۔ لیکن جہاں تک غور کی جاتی ہے۔ اس تخفیف میں تو کسی طرح سرکار کا پورا پڑنا نظر نہیں آتا۔ الٹی رعیت کی خرابی ہوگی۔ گورنمنٹ کے سیکرٹریٹ اور اکاؤنٹنٹ کے دفتر میں اگر تخفیف ہو، تو خود گورنمنٹ کو دقت پڑے، اور نگرانی اور اوپر کی سنبھال میں فرق آئے، ممکن ہے، کہ گورنمنٹ اس کی نگرانی اور سنبھال کے لئے اسی پر اکتفا کرے کہ کچھ ضروری ضروری کاموں کے لئے تھوڑے اہل کار اور عملہ رکھ لے، یا سب کو کہے کہ سلام کرو۔ اور گھر بیٹھو۔ لیکن اس طرح سے شاید کام چلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اسی واسطے ان دفتروں میں تخفیف کرنے کا کچھ ذکر نہیں ہے، اور ریونیو بورڈ ایک ایسا دفتر ہے، کہ اسی پر مال کا مدار ہے، اسی لئے وہ بھی تخفیف سے محفوظ ہے۔ اب چلو کمشنری سے سو وہاں حاکموں کی تنخواہیں تو تین تین ہزار اور ان کے سررشتہ دار یا ہیڈ کلارک جن سے تمام کام نکلتے ہیں۔ گویا کمشنروں کے ہاتھ پاؤں یہی ہیں۔ ان کی تنخواہیں سو ڈیڑھ سو کے اوسط سے زیادہ نہیں۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ پچیس پچیس گنا تو یہی فرق ہے۔ جب تخفیف سے اور زیادہ ہوا، تو ادھر ہندوستانیوں کے روزگار میں خلل پڑا۔ کیونکہ بیشتر یہی ان عہدوں پر مقرر ہیں۔ ادھر رشوت ستانی کی رغبت کیلئے ایک نیا سبب پیدا ہوا۔ اور کلکٹروں اور مجسٹریٹوں کے دفتروں میں تو ذرہ سی تخفیف میں رعیت پر ایک بڑی آفت آن ٹوٹے گی۔ سرکار کے لئے یہ بات بہت غور کرنے کے لائق ہے، کہ سوائے کاغذی گھوڑا کی سواری کے جس سے مراد رپورٹ وغیرہ ہے۔ جو لبہ بھگت جانیے سب کاموں کے صرف گورنمنٹ کے سمجھانے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور جتنی باتیں ہیں، عملہ کے ہاتھ سے نکلتی ہیں۔ پانچ روپیہ کے محرر سے سو ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تک کے سررشتہ دار ان سب کاموں کو پورا کر کے کلکٹروں اور مجسٹریٹوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں، تب وہ ان پر حکم چڑھاتے ہیں۔ اگرچہ یہ حاکم کیسے ہی ہوشیار ہوں، لیکن ان لوگوں پر اعتبار رکھے بغیر ان کا کام ایک دم بھی نہیں چل سکتا۔ سو ان کی تنخواہوں اور کلکٹروں اور مجسٹریٹوں کی تنخواہوں میں اتنا فرق ہے، کہ کہیں قریب دس گنے کے اور کہیں اس سے بھی بہت زیادہ اور پھر ہر اہل کار کے ذمہ کام اتنا کہ تمام دن پسائی کرے، بلکہ رات کو بھی گرہ سے تیل منگا کے اور گھر کا چراغ جلا کے بیٹھے، تب اس سے چھٹکارا پائے، جب ان لوگوں کی تنخواہوں کا وہ حال اور کام کی یہ صورت اور اعتبار کی وہ حد کہ بدون اس کے جناب صاحب بہادر مد فاضل ہو کر بیٹھ رہیں، تو تعجب ہے کہ تخفیف کی صورت میں ان عملہ والوں کو تکلیف دی جائے۔ اور رعیت کے انصاف میں خلل ڈالنے کی رغبت پیدا کی جائے۔ پھر بھی آفرین ہے اس فرقہ ہندوستانی پر کہ باوجود اس کے روکھی سوکھی پر صبر کر کے اپنا کام دیتے ہیں، اور اپنی شہنشاہ ملکہ معظمہ کی بڑھتی دولت کی دعا کرتے رہتے ہیں، کہ افسوس ہے ان کے حال پر کہ جب سرکار میں ٹوٹا پڑے، تو ان بیچاروں کی تھوڑی تنخواہوں سے اس کے پورے کرنے کی فکر کی جائے۔ اسی طرح پولیس میں دیکھو، تو اب جناب سرجان اسٹریچی بہادر کے نئے انتظام سے جتنے عہدہ دار اہل یورپ انسپکٹر سے اوپر درجہ کے ہیں، سب بے کار ہو گئے۔ اور واقع میں پیشتر بدون ان کے پولیس کا انتظام ایسا ہی رعایا کے نزدیک چلا جاتا تھا، جیسا کہ اب ہے۔ لیکن اس پر بھی ان کی تنخواہوں اور ہندوستانی انسپکٹروں کی تنخواہوں میں بڑا فرق ہے، اور نیچے اتر کر کانسٹیبلوں تک دیکھا جائے اور صفائی کے چوکیداروں پر نظر کی جائے، کہ وہ بھی پولیس میں داخل ہیں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جس پر ان ادنیٰ ادنیٰ اہل کاروں کو رعایا کی نسبت وہ اختیار ہے کہ اچھے اچھے بھلے مانس ذی عزت ان سے ڈرتے ہیں۔ اب اگر ان کی تنخواہوں میں خدانخواستہ تخفیف ہو، تو اور بھی قیامت مچے۔ پہلے تو خود ان ہی کے بال بچوں پر آن بنے پیچھے رعیت کو ان کے ہاتھ سے مشکل پڑے۔ اور جو ان کی تعداد کم کی جائے۔

تو رعیت کے انتظام میں اسی قدر خلل پڑے، کیا عجب ہے۔ کہ وہی کانسٹیبل جو بے روزگار ہو کر گھر بیٹھیں۔ کوئی معاش کا ذریعہ نہ دیکھ کر چوری کو آسان وسیلہ پیٹ بھرنے کا سمجھیں مختصر یہ کہ بظاہر ہندوستانی عملوں میں تو ایسے بیان سے کسی طرح گنجائش تخفیف کی نظر نہیں آتی۔ البتہ بڑے بڑے عہدہ داروں میں تخفیف تنخواہ اور تخفیف عہدہ کی بہت گنجائش ہے۔ اسی طرح عدالت میں بھی اگر ہائیکورٹ کا ایک حاکم بھی کم کر دیا جائے، تو سیکڑوں کی تخفیف سے زیادہ کی تخفیف ہو جائے۔ اور ججوں کی تنخواہ کے کم ہو جانے سے بھی کسی طرح کا نقصان عدالت میں نہ ہو۔ بلکہ سررشتہ تو اسی لائق ہے، کہ بالکل نیا بندوبست کیا جائے۔ ان صیغوں کے سوا ایک صیغہ تعمیرات سرکاری ہے۔ اس میں بھی تخفیف کی بہت گنجائش ہے۔ اگرچہ اس کی نسبت گورنمنٹ ہند نے اتنا لکھا ہے، کہ اس کا سررشتہ زائد موقوف ہو۔ لیکن ظاہرا اس میں اور بھی بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے۔ بہر کیف محض ہندوستانی عملوں کی تخفیف سے پورا پڑنا دشوار ہے۔ اور یہ بات مصلحت سے بھی بعید ہے۔ خاص ایسے وقت میں کہ ادھر تو ولایت کے حکام ہندوستانیوں کو بڑے بڑے عہدوں کے دینے کی تجویز کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اس سلوک سے ہندوستانیوں کے دلوں کو خوش کریں۔ اور ادھر یہ تخفیف شروع ہو۔ دس پانچ کو بڑے بڑے عہدے دے کر خوش کرنا اور ہزاروں کو تخفیف کی بلا میں ڈالنا اور اس تخفیف سے جو اور خراب نتیجے پیدا ہوں گے، ان کو گوارا کرنا اور پھر یہ امید کرنا، کہ ہندوستان کے لوگ دل سے خوش ہوں گے، ہم کو اپنی سرکار عاقل اور عاقبت اندیش رحم دل کی دانائی کی تدبیروں کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں کہ ملکہ معظمہ نے اپنی ہندوستانی رعایا کو خیر خواہ اور دلی تابعدار سمجھ کر اس کو زیادہ راضی اور خوش کرنے کے لئے یہ عنایت کی۔ کہ اپنے واسطے ہندوستان کی شہنشاہی کا خطاب لیا۔ بالفرض اگر ایسا ہی ٹوٹا پڑتا ہے۔ اور ہندوستانیوں کی تخفیف ہی سے اس کا پورا پڑتا ہے۔ تو پھر برس دو برس بعد دیکھ لیا ہوتا۔ اس وقت تو بجائے اس خوشی کے اس تخفیف کا غم دینا نہ چاہیئے۔ اور جن کی تخفیف ہو، ان کے متوسلوں اور نوکروں چاکروں پر بے روزگاری کی بلا نہ ڈالنی چاہیئے۔ سوچنے کی بات ہے کہ نواب وائسرائے بہادر دہلی کے دربار کا اشتہار کس شوق سے دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ اس خطاب کی خوشی کو رعیت طرح طرح کے جشن اور خوشی کے سامان سے ظاہر کرے اگر ان ہی دنوں میں یہ تخفیف جاری ہوئی۔ تو تمام سرکاری دفتروں میں اس خوشی کے بدلے اس غم کا رونا پڑے گا۔ یہ نحوست ہم ہندوستانیوں کی ہے، کہ اگر ایک پھول ہاتھ آئے، تو اس کے ساتھ کانٹا بھی لگا ہوتا ہے۔ اور جو ایک پیالہ شربت کا ملے تو اس میں کچھ زہر بھی گھلا ہوتا ہے۔ سو دیکھو۔ کیا تو وقت اس خوشی کا کہ ملکہ معظمہ ہندوستان کی شہنشاہی کا خطاب لیں۔ اور کیا یہ آفت تخفیف کی کہ ہزاروں کے دلوں کو رنج پیدا ہو۔

قاتل تحصیلدار فتح آباد

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ ۲۹، دسمبر ۱۸۷۶ء)

صاحب راقم آگرہ اخبار رقم طراز ہیں، کہ مولوی عبد الحفیظ تحصیلدار فتح آباد کے قاتل کو ہائیکورٹ سے پانچ برس قید کی سزا ہوئی۔ کیونکہ صاحب جج آگرہ نے اس کے لئے سفارش کی تھی، کہ اشتعال طبع کی جہت سے یہ فعل اس سے سرزد ہوا۔ ہمارے نزدیک یہ رائے صاحب جج کی صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ قانون اشتعال طبع کے واسطے شرافت شرط ہے۔ ایک کمینہ آدمی کے واسطے اشتعال طبع سزاوار نہیں ہے دوسرے یہ کہ اشتعال طبع کے واسطے فوراً اس فعل کا کر بیٹھنا لازم ہے۔ اور اس موقع پر ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ قاتل خود اپنے اظہار میں بیان کرتا ہے، کہ دو مہینے سے میں ان کے مارنے کی فکر میں تھا۔ پس یہ اشتعال طبع کہاں رہا؟ یہ تو ایک صریح خباثت اور آقا کشی تھی۔ جس کے عوض میں وہ ضرور سزا قصاص کے لائق تھا۔ اور اگر یہ قابل سزا نہ تھا۔ تو ریڈر صاحب کا قاتل کیوں اشتعال طبع کی وجہ سے سزا سے بری نہ ہوا۔ حالانکہ صاحب موصوف بھی بدزبانی اور دشنام دہی اور نوکروں کے زد و کوب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور جس وجہ سے وہ قتل ہوئے، وہ بھی یہی تھی۔ مگر ہمارے نزدیک اس وقت مناسب یہی تھا، کہ ہائیکورٹ ایک ہندوستانی قاتل کو بھی جرم قتل سے بری فرما کر اس بات کو ثابت کر دیتی، کہ کچھ عدالت ہائے انگریزی کے نزدیک یورپین قاتل ہی قتل کے جرم سے بری نہیں ہو جاتے، بلکہ ہندوستانی قاتل بھی بعض اوقات اس جرم سے بری کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اس ثبوت کے بعد ہائیکورٹ حضور گورنر جنرل بہادر کی اس تنبیہ کو ہلکا کر دے گی۔ جو انہوں نے فلر صاحب کے مقدمہ میں اسی بناء پر فرمائی، کہ ہندوستانیوں کی جان کے مقدمہ میں کچھ احتیاط نہیں کی گئی۔

ہمارے نزدیک بلاشبہ یہ قانون اشتعال طبع ضرور کسی حد کے ساتھ محدود ہونا چاہیئے۔ ورنہ ہم بہت اندیشہ کرتے ہیں، کہ اس کے سبب سے جرم قتل کی نہایت کثرت ہو جاوے گی۔ اور ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے، کہ ہم خاص یورپین لوگوں کے واسطے اس بندوبست کو چاہتے ہیں، بلکہ ہم ہمیشہ جان کے معاملے کو نہایت نازک اور ازبس اہم خیال کرتے ہیں۔ اور ہم کو ہمیشہ اس بات کا خیال ہوتا ہے، کہ قانونی حیلہ سے قاتل کا صاف رہا ہو جانا ضرور جرم قتل کو زیادہ کرے گا۔ اور ہم یقین کرتے ہیں کہ کوئی جرم قتل ایسا ثابت نہ ہوگا۔ جس میں قانونی حمایت سے اشتعال طبع ثابت نہ ہو جاوے۔ اور اگر قاتلوں کو یہ معلوم ہو جاوے گا کہ اشتعال طبع کے حیلہ سے قتل بھی کر سکتے ہیں، اور جان بھی بچا سکتے ہیں، تو ان کو کسی موقع پر اشتعال طبع کی صورت بنا لینا دشوار نہ ہوگا۔ دیکھو، اگر کوئی شخص کسی کے قتل کا مصمم قصد کر لے، اگر قتل سے پہلے وہ مقتول کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ یا حرکت کرے۔ جس کے مقابلہ میں مقتول کے ساتھ کی کوئی حرکت اس کے اشتعال طبع کا باعث بن جاوے۔ اور وہ اس حیلہ سے فوراً اس کو ہلاک کرے۔ پس اب ایسی صورت میں قانون اشتعال طبع ایسی مضرت ناک چیز ہوگا جس کی کچھ حد نہ ہوگی۔

ہمارے نزدیک اشتعال طبع کے اول تو معنی ہی نہایت وسیع ہیں۔ اور ان کی وسعت کے سبب سے قانون قصاص جو سراپا عدل پر مبنی ہے، بالکل ضعیف ہوا جاتا ہے۔ دوسرے ہم کو اس میں بھی نہایت کلام ہے، کہ قانون اشتعال طبع میں شرافت کی قید کیوں لگائی گئی ہے۔ اور اس کی کیا وجہ ہے، کہ اشتعال طبع کے مستحق شریف ہی قرار دیئے گئے ہیں۔ اگر یہ قانون اشتعال طبع قابل لحاظ ہے، تو ضرور وہ ہر ایسے شخص کے لئے قابل لحاظ ہے، جس میں اشتعال طبع کے معنی متحقق ہوں۔ اور اگر وہ انصاف میں مخل ہے، تو یک تحت ہر ایک کے واسطے محدود ہونا چاہیئے۔ اور گو بظاہر یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ رگ حمیت و غیرت شرفاء میں ہوتی ہے۔ کمینہ شخص میں یہ غیرت نہیں ہوتی۔ مگر ہمارے نزدیک شاید یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اور ہم اس امر کو ہمیشہ طبائع مختلفہ کے اختلاف پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شرفا میں اشتعال طبع کا بالکل مادہ نہیں ہوتا، اور کبھی کسی

بات مر افروختہ نہیں ہوتے۔ اور بعض اوقات کمینہ لوگ اپنی معمولی اور رسمی عزتوں کا پاس کرتے ہیں، اور ان میں اشتعال طبع کا مادہ ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات کمینہ آدمی زیادہ کاوش کی طبیعتیں رکھتے ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ ایک قومی خیالات سے پابند ہوکر اشتعال طبع کے مادہ سے خالی نہیں ہوتے۔ پس اس خیال کو خاص شرفاء کے واسطے تجویز کرنا۔ اور کمینہ کو علی العموم مستثنیٰ کر لینا شاید صحیح نہ ہو۔ بلکہ گالی اور زدو کوب پر ہمیشہ کمینہ آدمی دل میں کینہ پیدا کرتا ہے۔ اور بسبب اپنے جہل کے وہی زیادہ اپنے انجام سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور بے باکانہ حرکت کے ساتھ وہی زیادہ آمادۂ قتل ہو جاتا ہے۔ پس اس کی نسبت بالکل اشتعال طبع کا خیال نہ کرنا کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ علاوہ اس کے غیرت کی کیفیت ہر قوم میں مختلف ہے۔ وہ امور جو شرفاء کے نزدیک موجب غیرت ہوتے ہیں، یہ صحیح ہے، کہ کمینہ کے نزدیک وہ موجب غیرت نہیں ہوتے۔ مگر کمینہ کے نزدیک بھی اپنے حسب حال ایک خاص غیرت اور ایک خاص قسم کی عزت ہوتی ہے۔ اور وہ اسی لحاظ سے اشتعال طبع میں مبتلا ہوتا ہے۔ پس یہ کیوں کر ہو سکتا ہے، کہ اس کے واسطے اشتعال طبع نہ ہو۔ ظاہراً ہماری یہ بحث ہمارے مضمون کی ابتداء کی مخالف ہے کیونکہ ابتدا مضمون اس بات کو مقتضی ہے، کہ تحصیلدار فتح آباد کا ملازم اشتعال طبع کے حیلہ سے سزا سے بری نہ ہو۔ کیونکہ وہ کمینہ ہونے کی وجہ سے اس قانون سے مستثنیٰ ہے۔ اور آخر مضمون میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے، کہ اشتعال طبع کمینہ کو بھی ہونا چاہئیے۔ لیکن جبکہ یہ خیال کیا جاوے، کہ ہم دراصل قانون اشتعال طبع کو ہی اندیشہ ناک اور باعث ازدیاد جرم قتل سمجھتے ہیں، تو ہمارا مدعا صرف یہ ہے، اگر یہ قانون اشتعال طبع ہی محدود ہونا چاہئیے اور اگر محدود نہ ہو، تو پھر اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے، کہ شرفاء کو ہی ہو تو ہو۔ کمینہ کو نہ ہو۔ اور یہ ہم اس صورت میں کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اشتعال طبع صرف اس افروختگی طبع کا نام ہے، جو دفعتاً ایک غیرت دلانے والی بات سے پیدا ہو جاوے اور اگر اس کے کوئی اور معنی ہیں تو وہ دیکھنا چاہئیں، کہ کیا ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ عبدالحفیظ تحصیلدار کے قاتل کو سزا ہونی چاہئیے، یا نہ ہونی چاہئیے ہماری فیصلہ آخری بلاشبہ یہ رائے ہے کہ اس کی یہ حرکت ضرور حالت اطمینان میں ہوئی۔ وہ ہرگز اشتعال طبع کے سبب سے اس حرکت کا مرتکب نہیں ہوا۔ پس ضرور وہ قابل سزا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک مدت مدید سے اس فکر میں تھا کہ اپنے آقا کو کسی وقت فرصت میں قتل کیجئے۔ اور یہ ہرگز اشتعال طبع نہیں ہے۔ چنانچہ روز قتل میں بھی وہ بعد اس قصہ کے جس میں وہ اس حرکت کا مرتکب ہوا۔ بہت دیر بعد اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا۔ اور جب تحصیلدار صاحب سو گئے، اس وقت اس نے تمام کام کیا۔ اگر اشتعال طبع تھا، تو اس نے فوراً اسی وقت کیوں نہیں تحصیلدار صاحب کو مار دیا، جبکہ وہ اس کو مار رہے تھے، اور گالیاں دے رہے تھے۔ اور یہ اشتعال طبع نہیں ہو سکتا کہ جس وقت اس کو گالی دی گئی، اس وقت تو سمجھ بوجھ کر چپ ہو رہا۔ اور جب اس کو اطمینان کا موقع ہاتھ آیا، اس وقت فرصت میں قتل کیا۔ پس یہ بات کسی طرح اشتعال طبع نہیں رہا۔ اور اس وجہ سے وہ قابل رحم نہیں ہے۔

ہم اپنی اس رائے میں بالکل قانون اشتعال طبع کے اصول کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ہم اس کے معنی کی وسعت سے کسی قدر مخالف ہیں۔ اور نیز اس تخصیص کے مخالف ہیں کہ ایک انسان کے مخالف ہیں، کہ جن مواقع پر عدالتوں کی رائے میں اشتعال طبع قرار پاتا ہے، اس حالت میں البتہ بعض موقعوں پر اشتعال طبع نہیں ہوتا۔ اور اس صورت میں قانون گورنمنٹ پر الزام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک خاص کارروائی پر الزام ہو سکتا ہے

قابل نفرت حرکت

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڈھ ۱۵ اردسمبر ۱۸۷۶ء)

کیا ہم یہ ضرور نہیں ہے، کہ جو قابل نفرت حرکت ایک ہندوستانی سپاہی سے اپنے افسر کی نسبت ظہور میں آئی۔ اس کی نسبت ہم اپنا افسوس ظاہر کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے، تو ہم میزان انصاف کی دونوں جانب کو برابر نہ رکھ سکیں گے۔ راولپنڈی میں جو ایک سپاہی نے عین قواعد کے وقت اپنے افسر کی صرف اس قدر ملامت پر کہ اس نے سپاہی کے نشانہ کو ناپسند کر کے اس سے یہ کہا تھا کہ تمہارا ایسا نشانہ آفریدیوں کے مقابلہ میں کچھ مفید نہ ہوگا۔ اس افسر کو گولی سے ہلاک کر دیا۔ اور ایسے مہذب کلام کے مقابلہ میں ایسا بیہودہ کام کیا بلاشبہ اس کا یہ کام نہایت ہی نفرت اور افسوس کے لائق اور نہایت ہی بڑی تنبیہہ کے لائق نہیں ہے، جس مہذب اور لائق افسر کو اس بے حمیت اور جھوٹی غیرت والے سپاہی نے ہلاک کیا۔ ان کا نام لفٹنٹ ڈبلیو ہارس صاحب تھا۔ اور وہ ایک لائق اور مستعد افسر تھے۔

پس اگر فرض کرو، کہ وہ سپاہی اپنی اس حرکت کی پاداش میں سزائے پھانسی کا مستحق ہوا۔ تو یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی، کہ کیوں کر یہ سزا جرم کے برابر ہوگی۔ کیوں؟ ایک ایسے لائق افسر کی جان کے بدلہ میں ایک ایسے بدخو شخص کا مارا جانا کسی طرح اس کی عزیز جان کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب قانون کو دیکھا جاوے، جس کا منشاء بالکل فطرتی ضرورتوں کے موافق ہے۔ تو اس کے سوائے اور کیا سزا ہو سکتی ہے۔ کہ جان کے بدلے میں جان لے سکے۔ کیونکہ ہر امیر و غریب اور لائق و نالائق کے پاس اپنی جان سے زیادہ عزیز اور اعلیٰ درجہ کی کچھ شے نہیں ہے۔ پس یہ مجبوری لفٹنٹ ہارس صاحب کی اس جان کا بدلہ جو ان کے پاس سب سے زیادہ عزیز چیز تھی، اسی جان سے ہو سکتا ہے جو اس سپاہی کے پاس سب سے زیادہ عزیز ہوگی۔

بلاشبہ نہایت خرابی اور بڑے حیف کی بات ہے، کہ لفٹینٹ ہارس صاحب بہادر کی اس نرم اور شائستہ بات کے مقابلہ میں کہ

تمہارا یہ نشانہ آفریدیوں کے مقابلہ میں کچھ مفید نہ ہوگا۔ ایسی بے غیرتی کے ساتھ گولی سے جواب دیا جاوے۔ اور فوج کے آدمیوں کی وحشت کو ثابت کرے۔ یہ کام اس سپاہی کا صرف بے حمیتی کا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک قسم کی نمک حرامی کا بھی ہے، اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جاوے، کہ لفٹنٹ ہارس صاحب نے اس سپاہی سے کوئی بے تہذیبی کا کلمہ کہا، یا اس کو گالی دی۔ اس وقت تک ہر طرح سپاہی کی یہ حرکت نہایت نفرت کے لائق ہے۔ اگر ہم اس وقت یہ بات کہیں کہ جب ایسی ہولناک حرکت کا ظہور اس سپاہی سے ہوا ہے۔ تو ضرور ہے۔ کہ اس کا سبب کوئی قوی ہوگا۔ اور کسی طرح شبہ نہیں ہے کہ یا وہ سپاہی مجنون ہوگا یا اس کو لفٹنٹ ہارس صاحب سے کوئی ایسا رنج ہوگا۔ جس کے انتقام کا وہ موقعہ دیکھتا ہوگا۔ یا اس کو ضرور لفٹینٹ صاحب موصوف نے علانیہ سب کے سامنے گالی دی ہوگی، جس کو وہ اپنی عزت کے سبب سے سب کے سامنے نہ سن سکا۔ تو اس قسم کی رائے ایک تحقیقات کے مشابہ ہے، جو ہمارا کام نہیں ہے کیونکہ ہم سیشن یا مجسٹریٹ نہیں ہیں۔ بلکہ ہم صرف ایک اخبار نامہ کے ذریعہ سے سننے والے ہیں۔ اور ایسی حالت میں ہم کو بڑے افسوس کا اظہار کرنا چاہئیے۔

علاوہ اس سے اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی کچھ عرصہ ہوا سننے میں آیا تھا۔ اس واقعہ کا سبب یہ تھا کہ ایک رسالدار نے سپاہی کو گالی دی تھی۔ اور اس کے عوض میں سپاہی نے گولی سے جواب دیا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد عام حکم ہو گیا تھا کہ کوئی افسر کسی سپاہی کو گالی نہ دے۔ اور اس باب میں تاکید ہو گئی تھی۔ پس اب گمان نہیں ہو سکتا کہ یہاں بھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا ہو۔ اور لفٹیننٹ موصوف نے باوجود اس حکم کے کہ سپاہی کو پریڈ پر گالی نہ دو۔ اس کو گالی دی ہو۔ ہمارا جو ہم عصر اس بات کی سفارش کرتا ہے، کہ اس سپاہی کو جلد پھانسی ہونی چاہیئے۔ ہم بھی اس کی سفارش کو تسلیم کرتے ہیں۔

جو سپاہی فوج میں اپنی عمر گزار چکے ہیں، ان کا یہ مقولہ ہے کہ تھان پر اصل گھوڑے کو چابک اور پریڈ پر شریف سپاہی کو گال نہایت خطرناک کام ہے۔ اور جو تجربہ کار ہیں وہ بلاشبہ ان دونوں خطرناک کاموں سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ فوجی تہذیب اور قسم کی ہے، اور علمی تہذیب اور قسم کی ہے۔ پس اسی طرح وہاں کی غیرت اور حمیت بھی اور ہی قسم کی ہوتی ہے، جس کا لحاظ افسران دانش مند کے نزدیک نہایت ضروریات سے ہے۔ بلاشبہ فوج کے سپاہی اور افسر کی تمثیل ایسی ہے، جیسے کہ دل اور ہاتھ پیر۔ افسر بمنزلہ دل کے ہے، اور سپاہی بمنزلہ ہاتھ پیر کے۔ اور تمام فوج کی مجموعی حرکات اور اس کے کام بھی ایسے ہیں، جیسے انسان کے دل اور ہاتھ پیروں کے کام۔ پس جب تک ہاتھ پیر کام نہ کریں۔ دل نہیں رہ سکتا، اور جب تک دل ان کی حفاظت نہ کرے، کام نہیں چل سکتا۔ پس گورنمنٹ کا یہ حکم نہایت عمدہ ہے، کہ کوئی افسر پریڈ پر کسی کو گالی نہ دے۔ مگر افسوس ہے کہ جس نمک حرام سپاہی نے اس افسر کو ہلاک کیا۔ اس نے تو ایسا کام کیا۔ جس کا نہ کوئی سبب ہے، اور نہ اس کا انتظام ممکن ہے۔

وکیلوں اور مختاروں کا لباس ایک جیسا ہونا چاہیئے

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ۔ ۲۸ اپریل ۱۸۷۱ء)

یورپ کے ملکوں میں جہاں شائستگی نہایت ترقی پر ہے۔ خاص خاص پیشوں کے آدمیوں کا لباس بھی مخصوص ہوتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے وہ اور شخصوں سے بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک شخص مذہب رومن کیتھولک کے ایک پادری اور مذہب پراٹسٹنٹ کے ایک بشپ یا ارک بشپ کے درمیان صرف ان کے لباس کے ذریعہ سے بلا کسی وقت کے امتیاز کر سکتا ہے۔ ججوں اور بیرسٹروں کا بھی ایک خاص لباس ہوتا ہے۔ جس کو ان کے درجہ یا پیشہ کے لوگوں کے سوائے اور کوئی شخص نہیں پہن سکتا ہے، فوج کے آدمی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یعنی جنرل سے لے کر ایک عام آدمی تک ہر ایک شخص کی وردی اور شخصوں کی وردی سے علیحدہ ہوتی ہے۔ مگر ہندوستان میں باوجودیکہ انگریزی شائستگی کے ذریعہ سے اس کی حالت کو بہت کچھ ترقی ہوئی ہے۔ اس معاملہ میں صرف باستثنائے عہدیداران پولیس کے اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ضلع کے جج اور مجسٹریٹ اور وکلاء کے واسطے کوئی خاص لباس مقرر نہیں ہے، اور وکیلوں اور مختاروں کو بعض اوقات ایک معینہ قسم کے لباس کے نہ ہونے سے بڑی دقت پیش آتی ہے۔ عدالت ہائیکورٹ کے ایک معزز وکیل سے لے کر چھوٹے سے عرضی نویس تک کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کے ذریعہ سے اجلاس میں ان کے رتبہ میں امتیاز ہو سکے، جج اور مجسٹریٹ کسی قدر وہمی ہوتے ہیں۔ وہ ان کے لباس کی نسبت بعض اوقات بیہودہ احکام جاری کرتے ہیں۔ ایک جج تو یہ حکم دیتا ہے، کہ جوتی نہیں پہننی چاہیئے۔ اور ایک مجسٹریٹ یہ حکم دیتا ہے کہ سر پر کچھ نہیں پہننا چاہیئے۔ اور اس وجہ سے وکیل اور مختار ایک قابل افسوس حالت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور اپنی خاص وضع تجویز نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ حضور ان سے ناخوش ہو جاویں گے۔ پس ان کو حضور کے خیالات کے بموجب عمل کرنا پڑتا ہے۔ چند روز کا عرصہ ہوا کہ سر والٹر مارگن صاحب بہادر نے جبکہ وہ ان اضلاع کی عدالت ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ یہ بات چاہی تھی کہ عدالت ہائیکورٹ کے وکیلوں کے واسطے ایک یکساں لباس مقرر کیا جاوے۔ اور سر رابرٹ اسٹوارٹ صاحب بہادر چیف جسٹس حال کی بھی ابتدا میں یہی رائے تھی۔ مگر چونکہ بیرسٹروں نے اس کی نسبت اعتراض کیا۔ کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ گون کے پہننے کا صرف انہیں کو اختیار حاصل ہے۔ اس وجہ سے یہ تدبیر انجام کو نہ پہنچ سکی۔

ہم اس معاملہ کی تائید صرف اس وجہ سے نہیں کرتے ہیں کہ یکسانی لباس کے ہونے سے ایک وکیل یا مختار کے رتبہ کی وقعت زیادہ ہو جاوے گی۔ بلکہ ایک سخت خرابی کے دفع کرنے کی غرض سے کرتے ہیں۔

ہم نے حال ہی میں اس بات کا ذکر کیا تھا۔ کہ خاص عدالت ہائیکورٹ کی آنکھوں کے سامنے ایک جونیئر سویلین کی خود رائی سے ایک مختار کی کیسی بے عزتی کی گئی۔ اور چند منٹ تک وہ کیسی قابل افسوس حالت میں رہا۔

ان سویلین صاحب نے یہ خیال کیا کہ ان کی عدالت ایک ایسی مقدس عدالت تھی جس میں ایک مختار جوتا پہن کر نہیں آ سکتا تھا۔ اور ان کے نزدیک یہ جرم ایسا سنگین تھا کہ انہوں نے صرف اس بات پر اکتفا نہیں کیا کہ اس غریب مختار کو جوتے اتارنے کا حکم دیتے، بلکہ ان کے بغض کی کچھ حد ہی نہیں تھی۔ اور انہوں نے اس قدر جرأت کی، کہ اس مختار کے جوتے چند منٹ تک بطور سزا اس سنگین جرم کے جو اس سے وقوع میں آیا تھا، اس کے سر پر رکھوائے۔ چونکہ ہم اس معاملہ کی نسبت ایک علیحدہ آرٹیکل میں گفتگو کر چکے ہیں، اس وجہ سے ہم اس مقام پر اس کو طول دینا نہیں چاہتے ہیں۔ ہم اس مثال کو صرف اس بات کے ظاہر کرنے کے واسطے نقل کرتے ہیں، کہ اگر مختاروں کے واسطے کسی قسم کا لباس معین ہوتا، تو صاحب مجسٹریٹ وکلاء اور مختاروں کے کل فرقہ کی ایسی ہتک نہیں کر سکتے تھے، جیسی کہ انہوں نے اس خاص صورت میں کی۔

ہم بے انتہا مثالیں اس بات کی دے سکتے ہیں، کہ جج اور مجسٹریٹ خود مختاری کے ساتھ وکیلوں اور مختاروں کو جوتا پہنے ہوئے عدالت میں نہیں آنے دیتے ہیں۔ یہ صرف ادب و شائستگی کا معاملہ ہے کہ ایک آدمی معقول لباس پہنے اور مختار وکیل کو اس بات کی اجازت دینے سے کہ جوتے پہن کر کچہری میں آیا کرے، کوئی بڑا حق یا بڑی آزادی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے شائستہ ملکوں میں بیرسٹروں اور اٹارنیوں کی بلحاظ حسن معاشرت کے بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ اور جو بڑے بڑے کام ملک اور رعایا کی بہبودی کے واسطے جس سے وہ ایک طرح پر حامی ہوتے ہیں، جاری کئے جاتے ہیں۔ ان سب میں وہ سرگروہ ہوتے ہیں۔ پس اس کی کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں اس کے برعکس معاملہ ہے، اور حکام وکیلوں اور مختاروں کو بحیثیت مجموعی کس واسطے حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اگر ان میں بے ایمان آدمی ہوتے ہیں، تو بیرسٹروں اور اٹارنیوں میں ایسے آدمی ہوتے ہیں، جو کسی قسم کی احتیاط نہیں کرتے علاوہ اس کے ان کی بداعمالیوں کی سزا کے واسطے جو خاص خاص آدمیوں سے

وقوع میں آتی ہیں۔ ایک اور طریقہ ہے، اگر علی العموم کل فرقہ کو بُرا سمجھنے اور بلا امتیاز ان کے ساتھ بغض رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ ہر ایک آدمی اپنی عزت رکھتا ہے۔ خواہ وہ ہندو ہو، یا مسلمان یا عیسائی۔ پس جبکہ کوئی ہندوستانی ایک یورپین سے ملے۔ تو اس وقت از راہ خلوص باہم کچھ امتیاز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم اس بات کو جانتے ہیں، کہ جس مضمون کی نسبت بحث کر رہے ہیں، اس سے کسی قدر تجاوز کرتے ہیں۔ مگر ہم اس مقام پر چند باتیں صرف اس وجہ سے کہنا ضروری سمجھتے ہیں، کہ کل قوم کو یہ بات ناگوار ہے، کہ ہمارے حکام ہمارے ساتھ مثل کتوں اور کمینوں کے بلکہ بعض اوقات اس سے بھی بُری طرح پر پیش آویں۔ اگر وہ مختار کوئی یورپین ہوتا، تو صاحب مجسٹریٹ الہ آباد کی یہ جرأت نہ ہوتی، کہ اس کی کسی طرح پر بے توقیری کرتے۔ چونکہ ہم سابق میں یہ بات کہہ چکے ہیں کہ ذاتی عزت کچھ رنگ پر موقوف نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم اس حیثیت سے کہ ہم اضلاع شمال و مغرب میں ہندوستانیوں کے حامی ہیں۔ ہمیشہ اس بدسلوکی کی نسبت اعتراض کرنا چاہتے ہیں، جو مفصلات کے حکام ہمارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔

ہم نے اپنے ناظرین اخبار کی بہت کچھ سمع خراشی کی ہے۔ اب ہم خاتمہ پر گورنمنٹ کی خدمت میں یہ عرض کرتے ہیں، کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ گورنمنٹ کو اس خرابی کے رفع کرنے کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور وکیلوں اور مختاروں کے واسطے یکساں لباس قرار دینا چاہیئے۔ تاکہ آئندہ سے وہ بدسلوکی سے محفوظ رہیں۔ اور مفصلات کے حکام جس طرح چاہیں، ہمیشہ ان کے ساتھ پیش نہ آسکیں۔

شاہ جہان پور کا واقعہ

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۱۲ مئی ۱۸۷۶ء)

ہم جانتے ہیں کہ مقام شاہ جہان پور کی وہ ہولناک واردات جس میں تین ہندوستانیوں کا خون بہایا گیا۔ اب تو علی العموم مشہور ہو گئی ہوگی۔ اور جس یورپین نے یہ قتل کیا، اس کے حالات پر اطلاع ہو گئی ہوگی۔ اس کا یہ بیان کر مجھ کو اس وقت سے ہندوستانیوں سے سخت دشمنی ہو گئی ہے، جب سے کہ میں نے مقام کانپور میں اس یادگار کو دیکھا ہے۔ جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں مظلوم یورپین کے قتل کی بابت بنائی گئی ہے۔ ہندوستانیوں کو نہایت ترساں و لرزاں بناتا ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس نادان یورپین نے ان بیچارے ناکردہ گناہ ہندوستانیوں کے قتل کو اس ظلم کی مکافات تصور کیا۔ جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں کسی اور کی طرف سے ہوا تھا۔ اور جس میں ان مقتول ہندوستانیوں کا کچھ بھی دخل نہ تھا۔ ہم کو بہت افسوس ہے کہ اس درجہ تیرہ دماغی اس نامور قوم کے ایک شخص سے ظہور میں آوے، جس کا انصاف نہایت مشہور ہے۔ اور گو ہم خوب جانتے ہیں، کہ صرف اس ایک یورپین کی ایسی ظالمانہ حرکت اور اس کا ایک جاہلانہ خیال کچھ اس قوم کی منصفانہ نیک نامی میں خلل انداز نہیں ہے۔ مگر تاہم ہندوستانیوں کے خائف ہونے کے واسطے اس قدر مدت مدید کے بعد ایک یورپین کا ایسا خیال کافی ہے۔ ہمارے نزدیک بلکہ جملہ اہل عقل کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی بات اندیشہ ناک نہیں، کہ خاص امن و امان کے زمانہ میں جبکہ لوگوں کی طبیعتیں صاف ہو گئی ہیں۔ اور حاکم و محکوم کے باہم کمال محبت و اتفاق ہو۔ اور ایک دوسرے کی جانب سے مطمئن ہو۔ کوئی ایسی بات پیش آوے، جو گزشتہ فساد کے زمانے کو یاد دلاوے۔ اور صاف طبیعتوں کو دفعتاً برانگیختہ کرے۔ اور اسی وجہ سے ہم خیال کرتے ہیں، کہ ایسے امور کا قائم رکھنا نامناسب ہوگا۔ جو لوگوں کے دلوں میں فساد کی آگ کو بھڑکاویں۔ ہم کو دیکھنا چاہیئے، کہ ۱۸۵۷ء کو اب کس قدر مدت مدید ہوئی۔ اور اس عرصہ میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کو کیا کچھ استحکام ہو گیا ہے۔ اور جناب ملکہ معظمہ کے اس امن آمیز اشتہار نے ہندوستان میں کیسی کچھ امن پھیلادی ہے جس کے سبب سے، ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کالعدم محض ہو گیا ہے۔ مگر بایں ہمہ مدت وہ کیا چیز تھی، جس نے اس یورپین کو دفعتاً ایسا برافروختہ کر دیا۔ کہ اس کا کینہ ہندوستانیوں کی طرف، ۱۸۵۷ء کے کینہ سے کچھ زیادہ ہو گیا۔ اور کیا چیز اس کو ایسے وحشیانہ اور ہولناک فعل کا باعث ہوئی۔ ہماری دانست میں اس کا سبب صرف وہ یادگار ہے، جو کانپور کے اس موقع پر تیار کی گئی ہے جہاں یہ ہنگامہ واقع ہوا تھا۔ اگر اس وقت وہ یادگار نہ ہوتی، اور اس کا ایسا غمناک نقش بغض و عناد اور دلی کینوں کا یاد دلانے والا والا شان اس آب و تاب اور شد و مد کے ساتھ قائم نہ رکھا جاتا۔ تو ہرگز اس یورپین کی آتش کینہ اس قدر نہ بھڑکتی۔ اور ایسی بے رحمی کے ساتھ یہ ہندوستانی مقتول نہ ہوتے۔ اور ہندوستانیوں کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ اب تک اس زمانہ کے کینہ کا اثر بعض لوگوں کے دلوں میں باقی ہے ہم یقین کرتے ہیں کہ ایسی یادگاریں ہمیشہ ایسے ہی ہولناک خیالات پیدا کرتی ہیں۔ جو ایک امن کی حالت کو خراب کر دیتی ہیں، اور اس کے سبب سے ہمیشہ ایک بد نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

ایک زمانہ گزرا، جس میں ایک شیشہ کا چھوٹا سا بکس بنا کر اور ایک صلیب اس میں نصب کر کے جابجا یورپین صاحبوں کی طرف سے تقسیم ہوا تھا۔ اور اس بکس میں اسی کانپور کے ہولناک واقعہ کی تاریخ نہایت پرجوش کیفیت کے ساتھ دکھلائی گئی تھی۔ اور اس بکس کی تقسیم سے فائدہ یہ سمجھا گیا تھا کہ جس قدر مقامات مشہور و معروف ہیں، اور جہاں عام مجمع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بکس وہاں رکھا جاوے، تاکہ عام لوگوں کو ہندوستانیوں کی سفاکی اور ظلم کی مقدار معلوم ہووے۔ پس اس بکس کا بھی ثمرہ یہی تھا، کہ لوگ دیکھ کر اس کو اپنے سینہ کی صفائی سے محروم ہو کر غضب ناک بن جاویں۔ اور علی العموم جہان میں اس کی بدولت غم و غصہ پھیل جاوے۔ جس کے سبب سے ہمیشہ حاکم و محکوم شیر و بکری کی مثل بنے رہیں۔ اور ہرگز باہمی محبت اور صفائی پیدا نہ ہو۔ چنانچہ وہ بکس ایک عرصہ تک ہماری سوسائٹی کے اخباروں کے کمرہ میں رکھا رہا۔ جس کو ہمیشہ وہ یورپین چشم غضب سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ جو اخبار پڑھنے کے واسطے سوسائٹی میں آتے تھے۔ مگر ہم نے اسی خیال سے کہ ایسی شے کے ہر وقت سامنے موجود ہونے سے سوسائٹی کا اصلی مطلب فوت ہوتا ہے۔ اس کے سامنے سے دور کروایا۔ اور یہ خیال کیا کہ یہ سوسائٹی خاص اس واسطے بنائی گئی ہے۔ کہ اس کے سبب سے باہم ہندوستانیوں اور انگریزوں کے میل ملاپ ہو۔ اور یہ بکس ہنگامہ کانپور کا یاد دلانے والا اور غصہ بڑھاتا ہے۔ جو سراسر اس مدعا کے خلاف ہے، اور ہم کو یاد ہے، کہ اس بارے میں ہم نے اپنی ایک رائے بھی دی تھی۔ جس کا منشاء یہ تھا کہ ایسی یادگاریں ہمیشہ کینہ کو تازہ کریں گی۔ اور فساد کو بڑھاویں گی۔ پس اسی طرح ہم اب یہ رائے ظاہر کرتے ہیں، کہ ہماری گورنمنٹ پر بہ نظر بقاء امن و امان ضرور ہے، کہ وہ ایسی جملہ یادگاروں کو نیست و نابود کر دے۔ اور جو باتیں ان میں دلوں کو سخت ہلانے والی ہیں، ان کا استیصال واجب سمجھے۔ اور اگر اس کو ایسی یادگاروں کے باقی رکھنے کی اس لئے ضرورت ہو کہ اس کے سبب سے ایک تاریخی واقعہ یاد آتا ہے۔ تو ہماری رائے میں وہ ضرورت اس کی ۱۸۵۷ء کی تحریری تاریخ سے بخوبی پوری ہو سکتی ہے۔ اور اس خاص صورت کی یادگار تاریخی واقعہ کو اس قدر یاد نہیں دلاتی۔ جس قدر کینہ اور عداوت کی یاد دلاتی ہے۔ تحریری تاریخ کے نتائج سے ہمیشہ وہی دماغ فائدہ حاصل کرتے ہیں، جو عقلی روشنی سے منور ہوتے ہیں۔ اور تاریک دماغ کوئی ان سے نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ بخلاف

ایسی یادگار ہے جو ایک ہنگامہ کی صورت مثالی تیرہ خیال آدمیوں کے قلوب میں پیدا کرتی ہے، اور اس کے سبب سے بے ساختہ ان سے ایسی ہی حرکات سرزد ہوتی ہیں جیسی کہ اس یورپین سے شاہ جہاں پور میں دفعتاً سرزد ہوئیں۔ غرضیکہ امن و امان کے زمانہ میں خطرناک ارادوں اور خیال کا پیش کرنا نہایت مضر ہے۔ اور اس کے انسداد کی تدابیر اس سے بہتر کچھ نہیں ہے، کہ جو امور اس کے باعث ہوں، ان کو رفع کر دیا جاوے۔ اور چونکہ کانپور کی یادگار اور اس کی شل جہاں کہیں یادگار ہو، وہ ایسے ہی خیال کا باعث ہے۔ پس اس کا دور کرنا گورنمنٹ پر ضروریات سے ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہماری یہ رائے قابل توجہ معلوم ہوگی۔

قانون میعادِ نکاح

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۱۲؍ مئی ۱۸۷۶ء)

ہماری نظر سے بعض لوگوں کی یہ رائے گزری ہے، کہ گورنمنٹ کو چاہیئے، کہ وہ ہندوستانیوں کو صغر سنی میں بچوں کا نکاح کرنے سے منع کرے۔ اور نکاح کے واسطے عمر کی ایک حد خاص مقرر کر دے۔ تاکہ اس کے سبب سے ہندوستانی ان خرابیوں سے محفوظ رہیں، جو صغیر السن بچوں کا نکاح کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ جہاں تک ہم نے فکر کی ہم کو یقین ہوا کہ اس تدبیر کے مجوز نے اپنے اس خیال کو سراسر قومی ہمدردی اور محبت وطنی کی بنا پر ظاہر کیا ہے اور جو قباحتیں صغر سنی کے نکاح کی بدولت اس کی نظر سے گزری ہیں۔ شاید ان کے خیال سے اس کو ایسی رائے دینے پر مجبوری ہوئی ہے۔ اس کو ہندوستانیوں کی بعض خام خیالیوں سے شاید یہ امید نہیں رہی، کہ وہ اپنے اخلاقی کام کو بھی بغیر دست اندازی گورنمنٹ کے کر سکیں۔ پس اس مایوسی نے اس کو اس خیال پر آمادہ کیا ہے، کہ ایسے نازک معاملات میں بھی گورنمنٹ کی دست اندازی کا خواستگار ہو۔ مگر ہم کو امید نہیں ہے، کہ یہ رائے کسی کے نزدیک قابل تسلیم ہوگی قطع نظر اس امر سے کہ جو امور ہمارے اخلاقی معاشرت سے متعلق ہیں۔ اور جن کو ہم تدبیر منازل کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ اور جن کو ہم ایک ضرورت فطری کے متعلق سمجھ کر اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ ان میں ہم کسی طرح بیگانہ مداخلت کو ہرگز جائز نہیں سمجھتے۔ معاملات نکاح و طلاق اور ارث وغیرہ کو ہم ایک اور وجہ سے بھی اس قابل نہیں سمجھتے۔ کہ اس میں کسی طرح گورنمنٹ کی مداخلت کو جائز تصور کریں اور وہ یہ وجہ ہے کہ یہ معاملات ہمارے نزدیک ایک لحاظ سے عبادات میں بھی داخل ہیں۔ جس کے لحاظ سے اب ان میں ہمارے وہ ارادے اور اختیار جو ہمارے حدود شرعی کے خلاف ہوں، محض معطل اور بے کار ہو گئے ہیں۔ اور جہاں ہماری اور ذاتی کمی و بیشی کو کچھ مجال باقی نہیں رہی۔ اور چنانچہ جو امور اس قسم کے ہوں، ان میں ہم کو مجبور سمجھ کر ہماری گورنمنٹ خود کسی طرح کی مداخلت کو پسند نہیں کرتی۔ اور وہ ایسی دست اندازی کو خلاف انصاف اور نیز خطرناک تصور کرتی ہے۔ پس یہ کیوں کر متصور ہے، کہ میعاد عمر نکاح کے واسطے وہ کسی قانون کو پاس کر کے ایک ایسی دست اندازی کو جائز تصور کرے، جو کسی طرح ہندوستانیوں اور گورنمنٹ دونوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہندوستان کی رعایا کے دونوں فرقہ ہندو مسلمان اپنی اپنی شرع میں اس قید کو نہیں پاتے، کہ لڑکے یا لڑکی کا نکاح فلاں عمر میں کیا جاوے۔ بلکہ جہاں تک دیکھا جاوے یہی ثابت ہوتا ہے، کہ باب ہندوان میں عجلت کی جاوے۔ پس کیوں کر ہو سکتا ہے، کہ گورنمنٹ اس کے لئے اپنے اختیار سے کوئی حد مقرر فرما دے۔ بلکہ ہم خیال کرتے ہیں کہ بہت زیادہ مخالفت اس رائے سے ہندوستان کے ہندو باشندے کریں گے۔ جن کے ہاں کنواری لڑکی کا ایک ایک ساعت کا وبال ماں باپ کے ذمہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور جس قدر چھوٹی عمر میں شادی ہو۔ اسی قدر زیادہ باعث ثواب تصور کیا جاتا ہے۔ پس اگر کوئی قانونی مزاحمت ان کے واسطے ایسی تجویز ہوگی، جو ان کو اس وبال سے بچنے اور ثواب کے حاصل کرنے سے باز رکھے، تو وہ اس قانونی مزاحمت کو مثل اسی مزاحمت کے سمجھیں گے۔ جو ان کو اپنے مذہبی معاملات میں حد سے زیادہ شاق اور دشوار معلوم ہوتی ہے۔ اور جس کے لحاظ سے وہ اپنے کو سراسر مجبور و معذور تصور کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان بھی اس مزاحمت پر رضامند ہونے کو اپنے مذہب کے خلاف تصور کریں گے۔ اور قید عمر کو اپنے دین کی ہدایت کے خلاف سمجھیں گے۔ اور بغیر اس رضامندی کے ایسے قانون کا تجویز کرنا گورنمنٹ کی ملکی اور اخلاقی مصلحتوں کے سراسر خلاف ہے۔ اور گو مسلمان اپنے مذہب کی رو سے قبل از بلوغ نکاح کو کوئی بڑے ثواب کی بات نہیں تصور کرتے۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہے، کہ وہ اس کو کسی عمر میں ناجائز بھی نہیں کہتے۔ اور اس کے مخالف قانون کا تجویز ہونا ان کی مذہبی اجازت کو باطل کرے گا۔ اس واسطے وہ ضرور اس مزاحمت کو خلاف مذہب تصور کر کے نہایت مخالفت کریں گے۔ اور اگر جبر کیا گیا، تو وہ اس کو اور مذہبی معاملات کا جبر تصور کریں گے جو کسی وقت میں گورنمنٹ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اگر گورنمنٹ نے اسی رائے پر خیال کیا تو مسلمان خیال کریں گے، کہ متعدد نکاحوں کے معاملات میں بھی گورنمنٹ دست اندازی کرے گی۔ کیونکہ وہ بھی تو گورنمنٹ کے نزدیک نہایت قبیح رسم ہے اور جب یہ دست اندازی جائز ہو گئی، تو پردہ کے باب میں کیوں نہ دست اندازی کرے گی۔ جو اس کے نزدیک صدہا طرح کی قباحتوں پر مشتمل ہے۔ اور جب یہ دست اندازیاں گورنمنٹ کے نزدیک جائز ہو گئیں، تو پھر مسلمان یقین کر لیں گے، کہ اب گورنمنٹ کی رعایا کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اور یہ یقین گورنمنٹ کے ذمے ایک بڑا الزام ثابت کرے گا۔ اور ہندوستان کی رعایا کو زلزلہ میں ڈال دے گا۔ ہم کو افسوس ہے کہ اس قسم کی رائے دینے والے صرف ان ظاہری مصلحتوں پر نظر کرتے ہیں، جو چنداں اہم تو نہیں ہوتیں، اور ان باطنی مصلحتوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں، جو نہایت اہم ہوتی ہیں۔

اگر ہم مذہبی اور اخلاقی وجوہ سے قطع نظر کریں۔ تاہم یہ رائے ہمارے نزدیک اس لئے صحیح نہیں ہے، کہ اس قسم کے معاملات میں جو خرابیاں واقع ہیں، وہ سب ہمارے طرز معاشرت سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور امور معاشرت کے واسطے کوئی حد نہیں ہے۔ جس کا کسی طرح احاطہ ممکن ہو۔ پس اگر فرض کرو کہ ایک کام میں زبردستی گورنمنٹ نے اصلاح کر دی۔ تو دوسری بات میں کیا ہوگا؟ اور اگر دوسری بات میں بھی گورنمنٹ نے کچھ نہ کیا، تو آئندہ کیا گورنمنٹ ہمارے واسطے کوئی اتالیق کا کام نہیں کر سکتی۔ کہ وہ ہر وقت ہمارے سونے جاگنے، کھانے پینے، شادی بیاہ، غم والم میں اصلاح کرتی رہے گی۔ اور جو کام ہمارے کرنے کے ہیں، ان کو وہ کرتی رہے گی۔ بلکہ ہم کو ضرور ہے، کہ اگر ہم اپنی کسی طرز معاشرت میں کوئی عیب دیکھیں، تو خود ہی اس کی اصلاح کر لیں۔ پر گورنمنٹ کی اعانت پر نظر نہ کریں۔

ہم کو اس رائے کے دیکھنے سے نہایت ہنسی آئی تھی۔ جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوؤں کی عورتیں گھاٹ پر جا کر برہنہ نہاتی ہیں۔ یہ ایک بے حیائی کی بات ہے۔ گورنمنٹ اس کی ممانعت کر دے۔ اسی طرح ایک شخص نے یہ رائے دی تھی، کہ شادیوں میں بعض عورتیں فحش گیت گایا کرتی ہیں، اور گالیاں دیا کرتی ہیں۔ گورنمنٹ اس کی ممانعت کر دے۔ ذرہ عقل سے غور کرنا چاہیئے، کہ جو عورتیں ننگی نہاتی ہیں۔ وہ خود اپنی

شرم نہیں رکھتیں۔ ان کے ورثا ان کو منع نہیں کرتے پھر گورنمنٹ کو کس بنا پر مزاحمت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جو عورتیں گالیاں دیتی ہیں، وہ کچھ باک نہیں رکھتیں۔ اور جن کو گالیاں دیتی ہیں۔ وہ مدعی نہیں بنتے۔ بلکہ ایک ایک گالی ان کو ایک ایک گھونٹ شربت کا معلوم ہوتا ہے۔ پھر گورنمنٹ کو کیا ضرورت ہے۔ کہ کسی کے گھر جا کر دست اندازی کرے۔ ایسے معاملات میں گورنمنٹ کو منصب نہیں ہے بلکہ ہر قوم کے شرفاء کو منصب ہے۔ کہ وہ اخلاقی ذلّت سے محفوظ رکھنے کے واسطے اپنے اخلاقی قانون بناویں۔ ہر باب میں گورنمنٹ سے ایک قانون کی درخواست نہ کیا کریں۔ صغرسنی کے نکاح میں جو کچھ خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، سب لڑکی یا لڑکے کی طرف عائد ہوتی ہیں اور وہ سب ایسی ہیں کہ گورنمنٹ کو اس میں دست اندازی کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ پھر گورنمنٹ سے اس کی نسبت قانون کی درخواست کرنا بڑی عجیب بات ہے۔

بچہ کشی کی عجیب واردات

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۲۲ مئی ۱۸۷۶ء)

ہم اپنے گزشتہ پرچے میں لکھ چکے ہیں۔ کہ ایک پارسی عورت نے جو دو برس سے بیوہ ہے، ایک حرام کا بچہ جن کو عجیب جرأت سے اس کو قتل کرایا جس کی تفصیل یہ ہے کہ عورت مذکورہ نے بچہ جن کر ایک اور عورت کی صلاح سے اپنے باورچی سے کہا کہ تو اس بچہ کو ذبح کر ڈال۔ باورچی نے اس بچہ کو نہایت بے رحمی سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اور علانیہ یہ جرم کیا گیا۔ یہ بھی ہم کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بچہ کسی یورپین صاحب سے پیدا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے ہم خیال کرتے ہیں۔ کہ اگر وہ زندہ رہتا، تو اس کا نام شائستگی کا نتیجہ رکھا جاتا۔ جو نہایت موزوں نام ہوتا مگر افسوس ہے کہ اس نالائق ہندوستانی باورچی نے نتیجہ شائستگی کی قدر نہ کر کے اس کو ضائع کر دیا۔ اس بچہ کا اس بے رحمی سے مقتول ہونا صرف اسی وجہ سے افسوس کا باعث نہیں ہے، کہ ایک نفس انسانی ضائع ہوا، بلکہ اس کے سبب سے یہ بھی افسوس ہوا کہ ایک یورپین صاحب کا بچہ ضائع ہو گیا۔ اور اگر وہ زندہ رہتا، تو کیسا لائق اور عالی دماغ ہوتا اس پارسی عورت نے کیوں جرأت سے اس بچہ کو قتل کرایا۔ حالانکہ جو سزا گورنمنٹ کے قانون میں اس فعل کی ہے، وہ کچھ مخفی نہیں ہے۔ پس شاید اس کی وجہ بھی یہ ہوئی کہ اس پارسی عورت نے یہ خیال کیا ہو گا۔ (سیاں بھئی کوتوال اب ڈر کاہے کا) ہماری دانست میں بلکہ شاید علی العموم مغربی شائستگی کا اثر پارسی عورتوں میں بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہنوز ہندوستان کی حماقت کا غلبہ بھی چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ پارسی عورت اس بچہ کو قتل نہ کراتی۔ بلکہ حفاظت کے ساتھ بطور شائستہ اس کو کہیں پہنچا دیتی۔ تو وہ جرم قتل میں ماخوذ نہ ہوتی۔ چنانچہ شائستہ ملکوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے کچھ اس کا مواخذہ یا استغاثہ نہیں ہوتا مگر یہ جب ہوتا کہ ہندوستان کی حماقت غالب نہ ہوتی۔

ہم خیال کرتے ہیں، کہ بہت زیادہ مواخذہ کے لائق، بلکہ قتل کی اصلی سزا کے موافق وہ باورچی ہے، جس نے ایسی سخت بے رحمی کو بالکل جائز رکھا۔ اور اس فعل کا مباشر ہوا۔ جو چرچا اس قتل کا بمبئی میں ہے۔ اس کا سبب شاید یہی ہے، کہ وہ متمول پارسی عورت کا معاملہ ہے۔ اور صاحب یورپین بہادر اس کے واسطے علت فاعلہ مشہور ہیں۔

اگر ہم اس خبر کو دیکھ کر اپنے اس خیال کو اس جانب مائل کریں، کہ ایسی وارداتوں کا اصلی سبب کیا ہے۔ تو ہم کو بے تامل یہ کہنا پڑتا ہے، کہ اس کا سبب وہی ہوگی ہے جس کو ہم اسی قسم کے صدہا ظلموں کا اصل اصول خیال کرتے ہیں۔ اور اگر ہم اس کے اصلی سبب سے قطع نظر کریں، تو اس کا سبب کسی قدر وہ بے پردگی بھی ہے، جو پارسی لوگوں میں رائج ہے۔ اور جس پر ان کو صرف اعلیٰ درجہ کی شائستگی نے مجبور کیا ہے۔ پارسی اس بات کو خوب جانتے ہوں گے کہ چار بجے شام کو ایک بے نظیر فٹن پر بیٹھ کر ان کی عورتوں کی ہواخوری ان کو ایسے ہی سبز باغ دکھلا دے گی، جس کا نتیجہ ان کے حق میں ایسی ہی کامیابی ہو گی، جو اس شریف پارسی عورت کو ہوئی۔ اور جس کا بمبئی میں آج نہایت چرچا ہے۔ اور ہم گمان کرتے ہیں، کہ ہندوستان میں یہ شائستگی کامل اس وقت سمجھی جاوے گی جبکہ ایسے واقعات کا یہاں چرچا بھی نہ رہے گا۔

ہم کو ذرہ اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی طرز معاشرت بالکل شائستہ ملکوں کی طرز معاشرت کے خلاف ہے پس جو لوگ ہر ایک بات میں اس بات کے خواہاں ہیں، کہ ہم اپنے ملک کی طرز کو چھوڑ کر دفعتاً دوسرے ملک کی شائستگی کی طرز کو اختیار کر لیں۔ وہ ہندوستان میں سیاہ روئی سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

ہم کو تعجب ہے کہ صاحب راقم خبر نے اس خبر میں صرف اس بات کو تعجب کے لائق سمجھا ہے، کہ یہ واردات نہایت بے رحمی کے ساتھ واقع ہوئی، اور اس نے اس بات پر تعجب ظاہر نہیں کیا، کہ یہ بچہ کس شخص نے اور کس خاندانی عورت سے کس بداطواری کے ساتھ پیدا ہوا۔ مگر شاید اس نے اس واسطے چھوڑ دیا ہو گا، کہ اور لوگ خود تعجب کر لیں گے۔ پارسی عورتوں کی تعلیم و تربیت انگریزی خیالات کے لحاظ سے نہایت ترقی پر ہے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ انگریزی تربیت ایسی خواہش کی مانع ہوتی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ یہ عورت کیوں اس سے محروم رہی؟ اور اس پر انگریزی تربیت نے کیوں اثر نہیں کیا۔ مگر احتمال ہے کہ شاید اس تربیت میں وہ خام رہی ہو گی۔ اور رسوخ کا مرتبہ اس کو حاصل نہ ہوا ہو گا۔ بہر کیف یہ واقعہ عجیب ہے۔

ہندوستانیوں کا خون

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء)

جو تنبیہ حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر نے مسٹر فلر کے مقدمہ میں فرمائی۔ اس کے بعد سے بجائے اس کے کہ ہمارے کان میں یہ صدا کم پہنچتی، کہ فلاں ہندوستانی فلاں صاحب کے ہاتھ سے اور مارا گیا۔ برابر ہمارے کان میں یہ آواز پہنچتی رہی کہ آج ایک اور ہندوستانی کو فلاں یورپین نے ہلاک کر دیا۔ اور یہ خبریں ہم کو اسی طرح پہنچتی ہیں، جس طرح شکار کے موسم میں یہ خبریں پہنچتی ہیں، کہ ایک صاحب نے ایک ہرن یہاں سے مارا، اور دوسرے صاحب نے ایک ہرن وہاں سے مارا چنانچہ فلر صاحب کے مقدمہ کے بعد ایک خبر توپ خانہ کے صاحب کے ہاں پہنچی۔ جنہوں نے ایک پنکھا قلی کو مار کے لاتوں کے جان سے مار ڈالا۔ دوسری خبر ان صاحب کی پہنچی، جنہوں نے ایک ملاح کو راہ گزار عالم بقا کیا۔ تیسری خبر لکھنو کے چوکیدار کی پہنچی۔ جس کو شوقین گوروں نے بندوق سے شکار کیا۔ چوتھی خبر کراچی کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ٹیلیگراف کی پہنچی۔ جنہوں نے ایک شخص کو مار ڈالا۔ پانچویں خبر گورکھپور کے ایک تماشہ والا صاحب کی پہنچی، جنہوں نے ایک شخص کو سرائے میں لٹھ مار کر ہلاک کیا۔ چھٹی خبر جہلم کے ایک صاحب ایلچی نامی کی ہے، جو ملازم ریلوے ہیں۔ اور انہوں نے ایک پنکھا قلی کے سر میں ایک ضرب تمدہ پہنچا کر اس کو ہلاک کیا۔ غرضیکہ یہ چھ خبریں قتل کی ہیں، جن میں چھ غریب ہندوستانی مقتول اور چھ صاحب بہادر قاتل ہیں۔ اور ان جملہ مقدمات میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ ہوا۔

ہم کو ان تمام دردناک خبروں کے سننے سے نہایت افسوس ہوا ہے، اور وہ افسوس

کچھ صرف اسی وجہ سے نہیں ہے، کہ بیچارے غریب ہندوستانی ایسی بے رحمی کے ساتھ مارے گئے۔ اور ان کا خون ایک جانور کے خون بلکہ پانی سے بھی زیادہ بے قدری کے ساتھ بہایا گیا۔ اور باوجود اس کے ہندوستانیوں کی فریاد کی کچھ شنوائی نہیں ہے بلکہ بڑا سبب افسوس کا یہ ہوا، کہ ہندوستان میں جس طرح ہندوستانیوں کی فریاد شنوائی کے لائق نہیں ہے۔ اسی طرح شاید ہمارے حضور گورنر بہادر کے احکام کی بھی شنوائی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر ان کی شنوائی ہوتی۔ تو ان کا اثر یہ ہوتا، کہ اگر ہمیشہ کے واسطے نہیں، تو چند روز کے واسطے تو ضرور ہی ہندوستانیوں کو اس سختی سے نجات ملتی۔ اور کچھ تو ہمارے ملک کے حاکم متنبہ ہوتے، نہ کہ برخلاف اس کے برابر قتل ہو رہا ہے، اور کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔ کیا کسی کے نزدیک یہ امر کچھ انصاف سے بعید نہیں ہے، کہ انگریزی عملداری میں انسان جانوروں کی طرح مارے جاتے ہیں۔ کیا یہ وہی فعل نہیں ہے، جس کے سبب سے مشرقی سلطنتیں آج تک ظالم مشہور ہیں۔ اور ان کی بدنامی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ کیا ان کی نسبت یہی نہیں کہا جاتا تھا کہ ان کے عہد میں رعایا کی جان و مال کی حفاظت نہ تھی۔ ان کے جیل خانے خراب تھے۔ ان کے کارپرداز خود غرض اور ظالم تھے۔ پس کیا اے انصاف پسند لوگو! اب انگریزی عملداری کو یہ حرکتیں بدنام نہیں کریں گی؟ کیا غریب ہندوستانی اسی طرح میں آویں گے کہ ہمیشہ صاحب لوگوں کے گھونسوں اور لاتوں اور رولوں سے پٹ کر جان دیں گے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔ سلاطین مشرقیہ کے زمانہ میں جو حفاظت جان کی نہ تھی اس کے کچھ یہ معنی نہ تھے، کہ سلاطین اپنے ہاتھ سے ہمیشہ لوگوں کو قتل کر ڈالتے ہوں۔ یا علی الصباح بطور تماشہ دو چار کو قتل کا حکم دے دیتے ہوں۔ بلکہ ان کے عہد میں بعض ظلم پسند ایسے حرکات کا باعث ہوتے تھے۔ اور جب ان سے کچھ باز پرس نہ ہوتی تھی، تو ان کی جرأت بڑھتی تھی۔ اسی طرح اب یہ کیفیت ہے، کہ غریب ہندوستانی برابر مارے جاتے ہیں۔ اور قاتلوں کو چنداں عبرت نہیں ہوتی جس سے خود وہی آئندہ کو باز آویں۔ یا ان کو دیکھ کر کسی کو عبرت ہو۔ بلکہ جس وقت سے لارڈ لٹن صاحب بہادر کی تنبیہ کی نسبت پائنیر نے اعتراض کیا ہے۔ اس وقت سے یہ بھی امید نہیں ہے، کہ کچھ باز پرس ہو گی۔ کیونکہ ضلع کے حکام اور ڈاکٹر ضرور مقتول کو طحال کا مریض سمجھیں گے۔ اور اس کی مدت مرگ اتفاقیہ میں شامل ہوا کرے گی۔ اور اگر کوئی گورنر جنرل بھی اس باب میں دخل دے گا تو ہائیکورٹ کی ناخوشی ہو گی۔ اور اس گورنر جنرل کی کارروائی خلاف ضابطہ قرار پاوے گی۔ جس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا، کہ بہرکیف تمام امور خلاف ضابطہ میں صرف مقتول کا مر جانا ایک باضابطہ کارروائی ہے۔ پس ایسے موقع پر ہماری دانست میں اگر اس بناء پر کارروائی ہوا کرے، تو نہایت آسانی ہے۔ کہ ایسے مقتول کی نسبت صرف موت تقدیری کا حکم دیا جایا کرے۔ اور یہ لکھا جاوے، کہ گو اس کو صاحب نے مارا۔ مگر جب تک کہ اس کی تقدیر میں موت نہ تھی۔ وہ کیوں مر گیا؟ نظر بدیں اس کی موت کا سبب صرف امر تقدیریہ ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔ اس صورت میں نہایت بھاری الزام قانونی سے چنداں سروکار نہ رہے گا۔

قانون تعزیرات ہند کے اس حکم سے کہ اشتعال طبع کی حالت میں قتل عمد نہیں رہتا۔ اور اگر آلۂ قتل سے قتل نہ کرے، تو قتل عمد نہیں ہوتا۔ یہ نوبت پہنچ گئی تھی، کہ بے رحم لوگ نہایت جری ہو گئے تھے۔ اور ہر شخص اپنے دل کے غبار نکالنے اور قتل میں کامیاب ہونے کے واسطے اشتعال طبع کا حیلہ پکڑنے لگا تھا۔ مگر تاہم کچھ اندیشہ تھا۔ اور جب سے کہ شاہ جہاں پور میں ایک گورے کے ہاتھ سے تین ہندوستانی مقتول ہوئے۔ اس وقت سے آلۂ قتل کی بھی چنداں پروا نہ رہی۔ اور لکھنؤ میں آج کل ایک چوکیدار کا شکار بندوق سے ہوا ہے۔ اور اگر آئندہ ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جیوریوں کی نیت بخیر رہی۔ تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے فتنہ باز ہونے سے بڑی گنجائش ہوگی اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔

اگر ان چند وارداتوں کے ساتھ شاہ جہان پور کے تین خون اور فلر صاحب کے سائیس کا خون بھی شامل کر لیا جائے، تو یہ دس خون ہوتے ہیں، جو بہت تھوڑے عرصہ میں واقع ہو چکے ہیں۔ پس اگر گورنمنٹ انگریزی اپنی توجہ اس طرف مائل نہ کرے گی، تو ان کے نوجوان ولایت زادہ حاکم جو ابھی ہندوستان میں آئے ہیں۔ ہندوستانیوں کے قتل میں ایسے ہی بے باک ہو جاویں گے، جیسے اب وہ شکار پر بے باک ہیں۔ اور اس وجہ سے ہندوستانی رعایا کے دل میں ان کی طرف سے ایک ہولناک اندیشہ پیدا ہو جاوے گا اور اس کا نتیجہ تدبیر مملکت کے بالکل برخلاف ہوگا۔ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ ہندوستانیوں پر اسی طریقہ سے حکمرانی کرے، جس کو وہ بہ فطر انصاف پسند کرتی ہے۔ اور جس کے سبب سے اس کو تمام یورپ کی سلطنتوں پر نہایت شرف ہے۔ اور وہ اپنی بیدار مغزی کے موافق ایسے نازک مزاجوں کو کبھی مسلط نہ کرے گی۔ جو بجائے اس کے کہ اپنی عقلی روشنی سے رعایا کو اپنی گورنمنٹ کا وفادار بناویں۔ اور رہا سہا اندیشہ ناک کر دیں گے۔ اور ان کے دلوں میں بھی بے جا خوف بٹھلا دیں گے۔

اودھ اخبار اور منشی غلام محمد خاں

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۲۹ ستمبر ۱۸۷۶ء)

مندرجہ ذیل مضمون سرسید کے بلند اور اعلیٰ اخلاق کی بہت روشن اور واضح مثال ہے۔ منشی غلام محمد خاں ایڈیٹر اودھ اخبار لکھنؤ جن کا اس مضمون میں ذکر ہے۔ سرسید کے مخالفین میں سے تھے۔ اور اکثر ان کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے لیکن جب منشی نولکشور مالک اودھ اخبار نے ان کی مناسب قدر نہ کی۔ اور وہ دل برداشتہ ہو کر اودھ اخبار سے تعلق قطع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تو چونکہ آدمی قابل اور لائق تھے۔ اس لئے سرسید نے اس موقع پر ذاتی مخالفت کا قطعاً خیال نہ کیا۔ اور بڑے زور سے ان کی حمایت میں یہ مضمون لکھا۔ اور منشی نولکشور کو توجہ دلائی، کہ منشی صاحب کے الگ ہونے سے اودھ اخبار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا، لہٰذا ان کی قدر کریں، اور ان کو اخبار سے علیحدہ نہ ہونے دیں۔ (محمد اسماعیل پانی پتی) ہم کو افسوس ہے کہ اب تک ہمارے ہم وطنوں کی طبیعتیں کمال کی قدرشناس نہیں ہوئیں۔ اور جو اسباب ان کی ترقی کے ہیں، ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں۔ ہمارے ملک میں سے علم و فضل و لیاقت کے مفقود ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے، کہ اب کوئی صاحب کمال کو پوچھتا نہیں ہے اور جب خود اپنی طبیعتوں کا یہ حال ہو، تو اس افسوس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے، کہ اب ہندوستان میں کوئی صاحب کمال نہیں ہوتا۔ ہم کو یاد نہیں آتا کہ ہمارے ملک کے امرا اور دولت مند اور تاجروں نے کسی شخص کی قدر آج تک اس کی لیاقت کے سبب کی ہو۔ پس یہی آثار ملک کی ابتری کے ہیں۔ چونکہ ہم اس مضمون کو طول دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے اب ہم اپنے خیال کو ظاہر کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ منشی غلام محمد خاں صاحب ایڈیٹر اودھ اخبار اب برداشتہ خاطر ہو کر منشی نولکشور صاحب کے ہاں سے چلے آئے ہیں۔ اور گو انہوں نے ترک تعلق نہیں کیا، مگر ظن غالب ہے۔ کہ اب ان کا دل یاں جی نہ لگے۔ اور برداشتگی کا سبب صرف یہ ہوا ہے، کہ جو محبت اور محنت منشی صاحب ممدوح نے اودھ اخبار کی ترقی اور رونق میں فرمائی منشی صاحب

کو اس کا صلہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ملا، کہ ان کو ضعف بصارت کے مرض میں مبتلا ہونا پڑا۔ اور بجائے ترقی کے ان کو یہ تنزل نصیب ہوا، کہ ان کے نور نظر میں کمی ہوگئی پس کیا یہ بات افسوس کے لائق نہیں ہے، کہ منشی نول کشور سا نامور شخص ایک ایسے شخص کی نسبت جیسے کہ منشی غلام محمد خاں صاحب ہیں، بے اعتنائی کر کے ان کو ہاتھ سے کھووے اور اس بات کا خیال نہ کرے، کہ ایسے شخص کی علیحدگی سے ایسے مشہور اخبار کی ترقی میں جس کا شہرہ ہندوستان سے انگلستان تک ہے۔ کیا نقصان آوے گا۔ ہمارے نزدیک شاید اس بات کا تو کوئی منصف بھی انکار نہیں کر سکتا، کہ اودھ اخبار کی موجودہ ترقی منشی غلام محمد خاں صاحب کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ کوئی چیز نہ تھا۔ جو آب و تاب اس کو حاصل ہوئی۔ وہ صرف انہیں کی بدولت نصیب ہوئی۔ اور ہر مذاق کی بات اخبار میں نظر آنے لگی۔ اخبار پہلے ایک ہی بار چھپتا تھا۔ اب کئی بار ہو گیا۔ اور باوجود اس کے اس قدر لمبا چوڑا اخبار ہے، کہ آج اس وقت اس سے اردو اخباروں میں کوئی زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ پس باوجود ان سب باتوں کے منشی غلام محمد خان نے اس کو کچھ ایسا سنبھالا کہ بلاشبہ وہ اس کے سبب سے نہایت قدر کے لائق شخص ہوگئے۔

مگر نہایت تعجب ہے، کہ جتنی قدر منشی غلام محمد خاں کی اوروں کی نظر میں ہوئی۔ شاید منشی نول کشور صاحب کے نزدیک ان کی قدر اتنی بھی نہ ہو۔ ہم کو ذرہ شبہ اس بات میں نہیں ہے، کہ اگر منشی غلام محمد خاں صاحب اپنے ارادہ کے موافق علیحدہ ہو گئے، تو بلاشبہ اودھ اخبار اس حالت پر نہیں رہے گا۔ اور منشی نول کشور صاحب کو ایسا نیک نیت اور بے عذر اور لائق ایڈیٹر نہیں ملے گا۔ اگر اس وقت منشی نول کشور صاحب ذرہ چشم پوشی نہ فرمائیں گے، اور تھوڑی سی ترقی سے دریغ کریں گے، تو ان کو اودھ اخبار کی رونق میں بہت زیادہ نقصان گوارا کرنا پڑے گا۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ لوگ ہمارے اخبار میں منشی غلام محمد خاں صاحب کی نسبت اس رائے کے دیکھنے سے اس لئے تعجب کریں گے، کہ ہمارے اخبار میں پہلے ان کی اور قسم کی تحریریں وہ دیکھ چکے ہیں، لیکن چونکہ یہ اور مقام ہے، اور وہ اور مقام تھا۔ اس لئے وہ اس قسم کا تعجب نہ کریں گے۔ اور اس بات کا وہ یقین کریں گے، کہ ہماری لفظی منازعت قلبی منازعت تک منجر نہیں ہوتی۔ ہم بہ نظر انصاف اپنے ذمہ یہ بات واجب سمجھتے ہیں کہ اپنے ہم عصروں کی لیاقت کی قدر شناسی میں کبھی کوتاہی نہ کریں۔ اور جو بات ہماری ملک و قوم کی بھلائی کی ہو، اس کو قلم سے ضرور نکالیں۔

اخیر میں ہم یہ بات کہتے ہیں، کہ آج تک جو ہندوستانی اخبار سڑیل اور لغو اور بے اعتبار ہیں، اسی وجہ سے ہیں کہ اخباروں کے مالک ایڈیٹروں کی قدر نہیں کرتے، اور حتی الامکان مفت کام چلانا چاہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ وہی ہندی مثل ہوتی ہے۔

"جیسے تیری کومری ویسے میرے گیت"

ہم کو امید ہے کہ منشی نول کشور صاحب ضرور ہماری اس رائے کو بہ نظر غور دیکھیں گے۔ اور جو کچھ ہم نے اودھ اخبار کی خیر خواہی میں لکھا ہے، اس کو مان لیں گے۔

صاحب بہادر کی چوری

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء)

ہم نے اپنے صیغہ کارسپانڈنٹ میں ایک خبر ڈیرہ دون کی چھاپی ہے۔ جس میں سیل صاحب بہادر چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ اور آخر کار ضرب شدید کھا کر گرفتار ہوئے۔ اور اظہار دے کر دوسرے یا تیسرے روز مر گئے۔ اور ہم نے اس مقدمہ کی اس کارروائی کی کیفیت بھی درج کی ہے۔ جو عدالت فوجداری میں حاکم فوجداری نے کی۔ ہم دیکھتے ہیں، کہ اب تک اس مقدمہ میں ڈیرہ دون کے نہایت ایماندار مجسٹریٹ نے نہایت عمدہ کارروائی کی ہے، جس سے اس کا انصاف پسند ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ اس میں ایک طرف صاحب معزز یورپین اور دوسری جانب غریب ہندوستانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کیفیت بھی اب تک نہایت عمدہ ہے، اور پرداز مقدمہ بھی اب تک نہایت تعریف کے لائق ہے۔ ہندوستانیوں کو امید ہے کہ اگر یورپین اور ہندوستانی کے مقدمات میں اسی طریقہ سے انصاف کیا جاوے گا۔ تو جو شکایت اب ہے، وہ آئندہ نہ رہے گی۔ جو عرضی سیل صاحب کے بھائی نے اپنے بھائی کی موت کے اسباب دریافت کرنے کے واسطے دی ہے، وہ صاحب مجسٹریٹ بہادر کے طرز انصاف میں کچھ خلل نہیں پیدا کرتی۔ خصوصاً اس حکم کے دیکھنے کے بعد جو صاحب مجسٹریٹ بہادر نے سائل کی عرضی پر لکھوایا ہے۔ جو طریقہ سیل صاحب کے بیرسٹروں نے اختیار کیا ہے، وہ بھی کچھ خارج نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ مدعا علیہ یعنی اپنے موکل کے ذمہ سے الزام دفع کرنے کو اپنے موکل کو نشہ باز ثابت کریں۔ تو ان کا کام ہے۔ وہ صرف اسی بات کے نوکر ہوتے ہیں، کہ اپنے موکل کو بچائیں، اور جنون سے، نشہ سے، اشتعال طبع سے، غفلت سے، اتفاق سے غرضیکہ جس حیلہ سے بچا سکیں، اس کے بچانے میں کوشش کریں۔ ہاں البتہ بیرسٹروں کے اس عذر کو عدالت بھی تسلیم کرلے۔ اور ایسے صریح الزام میں صاحب ممدوح کو نشہ باز ٹھہرا کر کوئی اپنی رائے ظاہر کرے، تو البتہ کسی قدر افسوس کے لائق بات ہے۔ اور ایسی حالت میں عدالت کا انصاف دیکھنے کے لائق ہے۔

ہمارا کارسپانڈنٹ لکھتا ہے، کہ اگر سیل صاحب زندہ رہتے، تو اس حالت میں عدالت کا انصاف دیکھنے کے لائق تھا۔ مگر ہم اپنے کارسپانڈنٹ کو یقین دلاتے ہیں، کہ اب بھی عدالت کا انصاف اچھا ہوگا، اور دیکھنے کے لائق ہوگا۔ کیونکہ عدالت اب بھی یہ بات دکھلا سکتی ہے، کہ وہ اپنی تجویز میں سیل صاحب کو چوری کا ملزم قرار دے۔ یا صاف ان کو نشہ باز ٹھہرا کر بری کر دے۔ اور اس حالت میں ان کے ورثاء کو پولیس اور مالک مکان کو مواخذہ کے لائق ٹھہرا دے۔

ہمارے ناظرین اخبار دیکھیں گے، کہ یہ مقدمہ اخلاقی کیفیت کے لحاظ سے کس قدر سند کے لائق ہے۔ اور جس موقعہ پر کہ انگلستان کے شائستہ اور ہندوستان کے ناشائستہ لوگوں کی شائستگی اور ناشائستگی کا موازنہ کیا جاوے۔ تو کسی قدر کام آوے گا۔ ہندوستان کا ایک جھوٹا گواہ اس قدر قلق میں نہیں ڈالتا۔ جس قدر کہ انگلستان کا ایک جھوٹا گواہ قلق میں ڈالتا ہے۔ اور ہندوستان کا ایک چور اگر نقب پر مارا جائے، تو چنداں افسوس نہیں ہے، جس قدر کہ انگلستان کے ایک لائق شخص کے نقب پر مارے جانے کا افسوس ہے۔ اور شاید اس حالت میں اور بھی زیادہ افسوس کے لائق ہے، جبکہ وہ ایک معزز شخص کا بیٹا تھا، اور بڑا عالی خاندان تھا۔ اور اس کی کیا وجہ ہے، کہ انگلستان کا ایسا آدمی زیادہ افسوس میں ڈالتا ہے۔ یہ سبب ہے، کہ ہندوستانی نیم وحشی ہیں۔ اور انگلستان مرکز تہذیب ہے۔ پس اس کے اور اس کے عیب میں بھی اسی قدر فرق ہے۔ جس قدر کہ اس کی اور اس کی شائستگی میں فرق ہے۔

اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ، ۱۵؍ ستمبر ۱۸۷۶ء)

بعض اخبار کہتے ہیں، کہ پونا کی میونسپل کمیٹی پر ایک صاحب یورپین نے چالیس ہزار روپیہ کا دعویٰ اس ہرجہ کی بابت کیا، جو ان کی ایک ٹانگ کے ٹوٹ جانے سے ہوا. جس کی کیفیت یہ ہے کہ پونا کی حدود میونسپلٹی کے اندر ایک سڑک کے کنارے اینٹوں کی سرخی کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا. صاحب بہادر جو بگھی دوڑاتے ہوئے اس طرف سے نکلے. تو بگھی کا پہیہ اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا. جس کے صدمہ سے بگھی الٹ گئی. اور صاحب گر گئے. اور ان کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا. صاحب موصوف نے اس الزام میں میونسپل کمیٹی پر نالش کر کے سولہ ہزار روپیہ کی ڈگری حاصل کی. پس یہ ایک عجیب و غریب مقدمہ ہے. جس کو سُن کر ہم کو تعجب ہوتا ہے. اور اس قاعدہ کے بموجب بہت سی مشکلیں پیش آتی معلوم ہوتی ہیں. کیوں کہ اگر اسی طرح کبھی صاحب ممدوح کی بگھی راہ میں کسی شخص کے مکان کی دیوار سے ٹکر کھاتی، تو صاحب ممدوح صاحب مکان پر ٹانگ ٹوٹنے کا دعویٰ کر کے سولہ ہزار کی ڈگری حاصل کرتے، اور اگر آئندہ راہ میں ان کی بگھی کی جھپٹ میں کوئی آدمی آجاوے گا، اور صاحب کا گھوڑا اس کے سبب سے چونک جاوے گا. اور صاحب گِر کر ہاتھ پاؤں توڑ لیں گے. تو اس غریب پر نالش کر کے ہرجہ وصول کریں گے. اور وہ غریب جھپٹ میں مر گیا. تو صاحب اس کے ورثاء پر ہرجہ کی نالش فرماویں گے.

ہم کو حیرانی ہے، کہ میونسپل کمیٹی پر یہ دعویٰ کیوں کیا گیا. اور صاحب جج نے یہ دعویٰ کیوں سُن لیا. کیوں کہ در اصل صاحب ممدوح اگر نالش کر سکتے تھے، تو اپنی آنکھوں پر کر سکتے تھے، جن کو یہ نہ سوجھا، کہ ہم اندھا دھند بگھی کو کہاں لے جاتے ہیں. اور اینٹوں کے ڈھیر پر کیوں چڑھاتے ہیں؟ اور سڑک چھوڑ کر اس کنارے پر کیوں بگھی بھگاتے ہیں. اور اگر ان کی آنکھیں یہ عذر کریں، کہ ہمارا قصور کیا ہے! ہم تو صاحب بہادر کی عقل کے ماتحت ہیں. جو کچھ مواخذہ ہونا چاہیئے، صاحب بہادر کی عقل سے ہونا چاہیئے تو یہ عذر بھی قابل سماعت ہوگا. اور اس کے سبب سے صاحب بہادر کی عقل بھی مدعا علیہ قرار پاوے گی. لیکن اس عذر سے صاحب کی آنکھوں کی بالکل برأت نہیں ہو سکتی. کیونکہ جرم قتل یا ضرر رسانی میں کسی نوکر کا یہ عذر کہ مجھ کو میرے آقا نے فلاں شخص کی نسبت حکم قتل دیا تھا. اس لئے میں نے اس کو مار دیا. نوکر کو جرم قتل سے بری نہیں کرتا. مگر ہاں البتہ بعد ثبوت کے آقا بھی ماخوذ ہو سکتا ہے. پس نظر بدیں صاحب موصوف کی آنکھیں اور عقل دونوں مدعا علیہ ہو سکتی ہیں.

ہم کو یہ بات ظاہر کرنی چاہیئے کہ کسی موقع پر بضرورت ملبہ کا اکٹھا ہونا کچھ میونسپل کمیٹی کے حق میں جرم نہیں ہو سکتا. اور اگر وہ جرم سمجھا جاوے، تو میونسپل کمیٹی کوئی کام اپنا نہیں کر سکتی. کیونکہ سرکاری عمارتیں جو میونسپل کمیٹی کے اختیار سے بنتی ہیں ان میں ہمیشہ میونسپل کمیٹی سڑکوں پر ملبہ ڈالنے اور سرِ راہ بہت سے کام کرنے میں مجبور ہے. جب اس کی حد میں سڑک تیار ہو. تو اس حالت میں وہ سڑک کے کنارے پہلے سے کنکر جمع کرنے میں مجبور ہے. اگر وہ کسی موقع پر کنواں یا سڑک کی نالی بناوے تو وہ سرِ راہ ایسی چیزوں کے ڈالنے میں مجبور ہے. پس اگر ایسی حالت میں کوئی صاحب دوڑتے آویں، اور دھم سے کنویں میں گر پڑیں، تو صاحب کا قصور ہے. میونسپل کمیٹی کا کیا قصور ہے؟ اگر سڑک کی نالی میں گر کر وہ اپنی ٹانگ توڑ لیں، تو کمیٹی کا کیا قصور ہے!

اگر صاحب ممدوح یہ فرماویں. کہ بعد تیاری کے میونسپل کمیٹی کا کام ہے، کہ راہ صاف رکھے. تو ان کا یہ عذر مسلم ہے، مگر اس سے یہ لازم آتا ہے، کہ اسی طرح پر میونسپل کمیٹی اپنے کام کی کوئی حد مقرر کرے گی. کیونکہ اگر ہم فرض کریں کہ اس وقت میونسپل کمیٹی کا کام ختم ہوا. اور اس اثنا میں کوئی صاحب بہادر وہاں آکر گر پڑے. تو کیا وہ کہہ سکیں گے، کہ ہمارے آنے سے پہلے کیوں راہ صاف نہ ہوگئی. کیونکہ میونسپل کمیٹی کہہ سکے گی. کہ صاحب بہادر اس مدت سے پہلے گئے. جس مدت میں کہ وہ اپنی راہ کو صاف کر سکتی.

اگر صاحب موصوف کے دعویٰ کی نظیر ہندوستان میں قائم ہو گئی، تو آئندہ دانستہ کنویں میں گرنے والے کنواں بنانے والے پر اس بات کا دعویٰ کر سکیں گے، کہ اس نے کنویں پر چوکھٹا نہیں ڈالا تھا. اس لئے ہم گر گئے. اور اگر چوکھٹا بھی ہو، تو کہہ سکیں گے، کہ ایک محافظ کنویں پر کیوں نہیں بیٹھا تھا. جو ہم کو منع کرتا. اگر کوئی شخص کسی کی بندوق اٹھا کر اپنے اوپر سر کرے، تو اس پر بھی ہرجہ کا دعویٰ ہونا چاہیئے، کہ کیوں اس نے اپنی بندوق کو ایسے موقع پر رکھا کہ ہم اٹھا سکے، اور اپنے اوپر سَر کر سکے. کیسے تعجب کی بات ہے، کہ خود صاحب موصوف اینٹوں پر چڑھ گئے، اور اپنی نادانی سے اپنا پیر توڑ لیا. اور میونسپل کمیٹی سے سولہ ہزار روپیہ وصول کیا.

ہم کو اندیشہ ہے، کہ اگر یہی مزہ لگ گیا، کہ سولہ ہزار روپیہ ایک پاؤں کی قیمت ملتی ہے، تو بہت سے صاحب سڑک کے کنکروں پر بگھی چڑھا کر اپنا پاؤں توڑ لیا کریں گے. اور سولہ ہزار روپیہ وصول کر کے مزے اڑاویں گے. کیونکہ ڈاکٹر انگریزی ایسے ہوشیار ہیں. کہ ضرور وہ ٹوٹا ہوا پاؤں جوڑ دیا کریں گے. اور سولہ ہزار روپیہ مفت میں وصول ہوا کرے گا. ہمارا ایک ہم عصر لکھتا ہے، کہ دیکھو اس مقدمہ میں کیا انصاف ہوا ہے. ایک کی ٹانگ کی قیمت سولہ ہزار روپیہ ٹھہری ہے. اور فلر صاحب کے سائیس کی جان تیس روپیہ کی قرار پائی. مگر ہم کو اپنے ہم عصر سے اتفاق نہیں ہے. کیونکہ ہم جانتے ہیں. کہ فلر صاحب کے سائیس کی جان تیس روپیہ کی کیا، ایک کوڑی کی بھی نہیں ٹھہرتی. اس لئے کہ وہ تیس روپیہ جو وصول ہوئے. اگر وہ اس سائیس کے کسی وارث کو دلائے جاتے. تو البتہ ہم اس کو اس کی جان کی قیمت سمجھتے. مگر ہم کو معلوم ہے، کہ یہ تیس روپیہ بھی اس کے ورثاء کو نہیں دیئے گئے. بلکہ وہ بھی سرکاری خزانہ میں داخل ہوئے. اور وہ حق سرکار سمجھے گئے. بیچارے غریب سائیس کی جان تو مفت میں گئی، بخلاف اس سولہ ہزار کے. کہ یہ تو صاحب کو دلائے گئے ہوں گے. نظر بدیں یہ کہنا چاہیے، کہ ہندوستانیوں کی جان اور صاحبان یورپ کا رونگٹا بھی برابر نہیں ہو سکتا. بلکہ صاحب بہادر کا رونگٹا تو بڑی چیز ہے. ان کے کتّے کے رونگٹے کے برابر بھی نہیں ہے. کیونکہ بعض بعض صاحب لوگوں کے کتّے کا ہرجہ بھی فلر صاحب کے سائیس کی جان کے ہرجہ سے زیادہ ہوا ہے. اور انگریزی عدالتوں نے اس کو تسلیم کیا ہے. ہم کو انتظار ہے، کہ ہم اس مقدمہ میں پونا کی میونسپل کمیٹی کے جواب دیکھیں. اور جو عذر اس نے کیا ہے، اس کو سنیں. اور اگر کمیٹی نے بھی اپنے خرچ اپیل ڈگری کرائی ہے. تو اور بھی زیادہ تعجب کی بات ہو گی، جس کو ہم نہایت شوق سے پڑھیں گے.

کلکتہ میں ایک صاحب کا بھنگی سے مقدمہ

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ، ۱۵؍ ستمبر ۱۸۷۶ء)

ایک بھنگی کسی صاحب کے ہاں کلکتہ میں نوکر تھا. صاحب سے اور اس بھنگی سے

تکرار ہوئی۔ تو صاحب نے اس پر نالش کی، مگر مقدمہ خارج ہوگیا۔ ہم کو افسوس ہے کہ صاحب نے ایسے خفیف مقدمہ میں کیوں نالش کی، اور کیوں بھنگی کے برابر کھڑے ہوکر مدعی ہوئے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ خوب جانتے تھے۔ کہ جو بیان انہوں نے عدالت میں دیا۔ وہ چنداں لائق لحاظ نہ تھا کیا عدالت اس بات کا یقین کرسکتی ہے کہ صاحب بہادر نے بھنگی کو صرف برتن دھونے کا حکم دیا ہو۔ اور بھنگی نے بجواب اس کے حملہ کیا ہو۔ ایک ذلیل ملازم بلا وجہ یہ جرأت کرسکتا ہے، کہ اپنے آقا کا وہی کام نہ کرے، جس کا وہ نوکر ہو۔ اور کام کے مقابلہ میں حملہ کرے۔ کیا کسی کو یہ یقین آسکتا ہے کہ صاحب ایسے حلیم الطبع ہوں، کہ بھنگی کی گستاخی پر کچھ ہاتھ پیر نہ ہلاویں۔ بلاشبہ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے، کہ جب صاحب نے نہایت خفیف تصور پر بھنگی کو زیادہ سخت پکڑا ہوگا، اور مار پیٹ کی ہوگی۔ تو بھنگی نے ناچار ہوکر، اور مسٹر فلر صاحب کے سائمس کو یاد کرکے یہ خیال کیا ہوگا، کہ اگر میں بیٹھا رہا، تو مفت جان جاوے گی۔ اس لئے اس نے اپنی جان بچانے کے لئے گستاخی کی ہوگی۔ ہمارے قول کی تصدیق سعدیؔ کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

وقت ضرورت چو نماند گریز
دست بگیرد سر شمشیر تیز

اب ہم ذیل میں اس نتیجہ کو لکھتے ہیں۔

مسٹر برونز صاحب ساکن کرد کوڈلیس کلکتہ نے اپنے بھنگی پر حملہ آوری کی نالش کی جو ۲۵ ماہ گزشتہ کو واقع ہوا کہ ہے۔ صاحب موصوف نے بھنگی کو ایک قلعی کا برتن صاف کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس نے صاحب کی مرضی کے موافق برتن کو صاف نہیں لیا۔ صاحب نے کہا، پھر صاف کرو۔ جس پر مدعا علیہ گستاخی سے پیش آیا۔ اور جب صاحب بہادر لے کھڑے ہوکر اس سے کہا، کہ تو مکان سے نکل جا۔ تو بھنگی نے لوٹا کھینچ مارا جس سے صاحب کی ٹھوڑی پر گہرا زخم آیا۔ مدعی کا اظہار تو یہ تھا۔ لیکن اور گواہی سے ثابت ہوا: کہ طرفین سے حملہ کی نوبت پہنچی تھی۔ اس وجہ سے صاحب مجسٹریٹ نے مقدمہ خارج کر دیا۔

تو یہ اس مقدمہ کی روئیداد ہے۔

حیدر آباد کا ہنگامہ

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۲۰ جنوری ۱۸۷۶ء)

حیدر آباد دکن میں جو ایک ہنگامہ مولوی محمد زمان خاں صاحب کے قتل کے متعلق پیش آیا تھا اس کی تفصیلی خبر ہم اپنے گزشتہ پرچہ میں چھاپ چکے ہیں۔ اور ہم کو یقین ہے کہ یہ نامناسب واقعہ جس طرح ہمارے نزدیک موجب افسوس ہے، اور لوگوں کے نزدیک بھی موجب افسوس ہوا ہوگا۔ یہ افسوس ہم کو صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ مولوی محمد زمان خاں صاحب مظلوم قتل ہوئے، بلکہ ہم کو اس حیثیت سے افسوس ہے کہ اس کے سبب سے مسلمانوں کی اخلاقی حالت نہایت خراب معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کی جہت سے ان کے مذہبی خیالات طعن کے لائق مشہور تے ہیں۔ حالانکہ نفس الامر میں ان کی مذہبی حالت ان کے ایسے اخلاق کے بالکل منافی ہے۔

ہم کو مذہبی حالت کے ذکر کا موقع اس وجہ سے ملا کہ اس ہنگامہ کو جہاں تک تعلق ہے، ان کے مذہبی مزعومات سے تعلق ہے۔ گو فی نفسہٖ ان کے ایسے مزعومات ان کے مذہب کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ جس بے رحمی سے ایک جاہل اور خونخوار پٹھان نے ایک مولوی کو نماز میں ہلاک کردیا۔ اس طرح پر مسلمانوں کے مذہب میں کوئی قتل جائز نہیں ہے۔ بلکہ ایسا قتل مسلمانوں کے مذہب میں سب سے بڑا گناہ اور نہایت خطرناک کبیرہ ہے۔ جس کے واسطے خدا کی طرف سے فجزاءہ جہنم کا حکم ان کے قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ مگر چونکہ ان کی اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس سبب سے وہ اس وحشیانہ حرکت کو ثواب سمجھتے ہیں۔

جن دو فرقوں میں یہ قصہ واقع ہوا۔ ان میں سے ایک اہلسنت وجماعت کے نام سے مشہور ہے۔ اور دوسرا مہدویہ ہے۔ مگر افسوس ہے، کہ یہ حرکت ان دونوں گروہوں کی مذہبی ہدایات کے خلاف ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم جن ملکوں میں خراب ہے۔ اور جن ملکوں میں جاہل اور بد اخلاق شخص عوام الناس کے سرگروہ بنے ہوئے ہیں۔ بسا اوقات ان کی باہمی اختلافات سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے، کہ ایسے ہنگامے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا مرتکب خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہوتا ہے۔ یہ بات ہم نے بڑے تجربات کے بعد دریافت کی ہے، کہ جب مسلمانوں کے دو گروہوں میں اختلاف ہوتا ہے، تو یہ اختلاف صریح حرام اور حلال شے کی بابت نہیں ہوتا۔ البتہ مکروہ وغیر مکروہ یا مستحب ومباح کے درمیان ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف اس قسم کا نہیں ہے، کہ مسلمانوں کی مذہبی ہدایات کے بموجب مخالف گروہ کے قتل کو جائز کردے۔ یا ظلم کو جائز بنادے۔

اگر مولوی محمد زمان خاں کے قتل کا منشاء صرف یہی مذہبی خیالات تھے۔ اور ان کے قتل کا سبب ایسے ہی بیہودہ مزعومات تھے۔ تو اس سے زیادہ اور کیا بات افسوس کے لائق ہوسکتی ہے۔

اور مسلمانوں کی بدنصیبی پر اس سے زیادہ کیا کسی دلیل کی حاجت ہے۔ مولوی محمد زماں خان کے قتل کا سبب کوئی مذہبی تکرار نہیں ہے، بلکہ اور کوئی سبب ہے۔ تو بھی اس قسم کے ہنگامے مسلمانوں کے حق میں بدنامی کا نشان ہیں۔ ان کی یہ حرکات اُن پر اس بات کا الزام لگاتی ہیں کہ مسلمانوں میں ظلم کا مادہ زیادہ ہے۔ اور یہ ایک بڑی خرابی کا الزام ہے۔

مسلمانوں کی ایسی حرکات ہی اس امر کا باعث ہوئی ہیں، کہ جو ناواقف لوگ ان کے مذہب کی حالت سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ مسلمانوں کا مذہبی اثر یہی ہے، حالانکہ جس درجہ رحم آمیز خیالات اس مذہب کے ہیں۔ کسی مذہب کے نہیں ہیں۔

مگر چونکہ ان کی اخلاقی حالت خراب ہے۔ اس لئے ان کی یہ خرابی ان کی مذہبی بدنامی کا سبب ہوتی ہے۔ غرض کہ مولوی محمد زمان خاں کا قتل زیادہ افسوس کے لائق اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک ایسی بدنامی کا باعث ہے۔ جو مسلمانوں کی مذہبی حالت سے متعلق ہے۔

ہم کو ظن غالب اس بات کا ہے، کہ اس فساد کا منشاء کوئی مذہبی نزاع ہی ہوا ہے۔ کیونکہ مولوی صاحب کے مقتول ہونے کے بعد جو ایک قسم کا جوش وخروش مسلمانوں کے گروہ میں ہوا۔ اور ایک خاص گروہ میں تھا۔ عام نہ تھا۔ اور یہ ایک عمدہ علامت مذہبی تکرار کی ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ سنا گیا ہے، کہ حیدر آباد میں اس بات کا انتظام کیا گیا ہے، کہ ماہ محرم میں پھر یہ فساد تازہ نہ ہو۔ اور اس خوف سے بعض تدابیر کی جاتی ہیں۔ پس ضرور ہے، کہ یہ نزاع مذہبی کسی مذہبی واقعہ پر تھا۔ اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قتل مشورہ اور تدبیر سے ہوا۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ قاتل اس بات کا منتظر رہتا، کہ جب سر سالار جنگ بہادر حیدر آباد سے باہر تشریف لے جاویں، اسی وقت اس کا ظہور ہو۔ اور یہ قتل دفعتاً کچھ اشتعال طبع کی وجہ سے نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ جو کیفیت اس کے متعلق ہم نے دیکھی ہے۔ اس

سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ کوئی امر باعث اشتعال طبع ہوا تھا۔ بلکہ مقتول مولوی کا نماز میں ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے، کہ قاتل سے اور ان سے نوبت کلمہ و کلام کی بھی نہیں آئی۔ اشتعال تو نہایت بعید تھا۔

یہ امر نہایت اچھا ہوا، کہ قاتل اسی وقت نہ مارا گیا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک قاتل کا ایسے طریقہ سے مارا جانا سبب واردات کو ہرگز ظاہر نہ ہونے دیتا۔ پس یہ کمال نادانی ہے کہ قاتل کے قتل میں ایسی سرعت کی جاوے کہ سبب قتل پر اطلاع بھی حاصل نہ ہو۔

چونکہ قاتل زندہ ماخوذ ہو گیا ہے۔ پس سالار جنگ بہادر کی کوشش سے کچھ عجب نہیں ہے، کہ سبب قتل کھل جاوے گا۔ اور آئندہ کے فساد کا انسداد بخوبی ہو جاوے گا۔

جُوتے کا مقدمہ

(اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڑھ ۱۷ مارچ ۱۸۷۶ء)

جو لوگ وقت کی مصلحت اور زمانہ کی ضرورت سے بے خبر ہیں۔ اور جن کی نظر میں قومی عزت کوئی شے نہیں ہے۔ اور جن کو قومی ذلت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ شاید وہ اس خبر کو سن کر بھی بے خبر رہے ہوں گے، کہ سر اجلاس ایک نوجوان اسسٹنٹ الہ آباد نے ایک ہندوستانی مختار کا جوتا اتروا کر اس کے سر پہ رکھوا دیا اور چند منٹ تک اس کو اسی طرح کھڑا رکھا۔ چونکہ وہ ایک ہندوستانی تھا، اور اس کی عزت و بے عزتی کا اثر تمام قوم پر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے دور اندیش لوگوں کو اس خبر کے سننے سے نہایت ہی افسوس ہوا ہوگا۔ جو زبان دراز لوگ جن کے دماغ میں عقلی جوہر بہت کم رکھا گیا ہے۔ جوتے کے معاملے کو ایک خفیف بات کہتے تھے۔ اور اس کے متعلق بحث و حجت کو مضحکہ جتاتے تھے۔ اگر وہ اس خبر کو سن کر بھی اسی غلطی میں پڑے رہیں، تو بلا شبہ ان کی بے پروائی نہایت افسوس کے لائق ہوگی۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے، کہ ان کی قوم کے ایک شخص کے سر پر برسر عدالت جوتا رکھوایا جانا ان کے حق میں کس قدر ذلت کا باعث ہے اور قومی عزت میں نقصان آنا کس نتیجہ کا موجب ہے۔ کیا اب وہ اس بات سے خوش ہوں گے۔ کہ ان ہی کی جوتی ان ہی کا سر ہو؟ جس تیز مزاج افسر نے اپنی دانست میں اس حرکت کو اپنی حکومت کی شان سمجھا، ہماری دانست میں وہ اپنی ہم قوم گورنمنٹ کے عدل و انصاف کا حامی نہیں ہے۔ اور شاید وہ اپنی اس تیز مزاجی کے سبب سے گورنمنٹ کے عمدہ ملازموں میں شمار نہ ہو سکے گا۔ اس افسر نے شاید اپنے نزدیک ہندوستان میں اپنی عدالت کو انتہائی عدالت خیال کیا۔ جس کی داد نہ فریاد، ورنہ کوئی ضابطہ انصاف اس کارروائی کو منصفانہ نہیں کہہ سکتا۔ ہم یقین کرتے ہیں، کہ جب کبھی رعایا میں سے کوئی شخص کسی ایسی حرکت کا مرتکب ہوتا ہے، جو قانوناً جرم قرار دی جاتی ہے۔ تو کبھی اس کے لئے اس قسم کی زیادتی بھی محرک ہو جاتی ہے۔ اور اس بات کے خیال کرنے سے، کہ جب افسران عدالت ہی انصاف نہیں کرتے، تو ہم کو اپنا انصاف آپ کر لینا چاہیئے۔ نہایت آزردہ ہو کر لوگ ایسی کارروائی کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی عدالت جو اسی وجہ سے عدالت العالیہ کہلاتی ہے عدالت ہائیکورٹ ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں، کہ اس کے نزدیک ہندوستانیوں کا جوتا پہن کر آنا جانا کچھ خلاف آداب عدالت نہیں ثابت ہوا۔ بلکہ وہاں علی العموم تمام وکلاء اور اہل مقدمہ اجلاس کے کمروں میں بھی جوتا پہن کر جاتے ہیں۔ اور حکام عدالت ہرگز اس پر معترض نہیں کرتے پس افسوس ہے، کہ یہ نوجوان اسسٹنٹ کیوں اس کو خلاف آداب عدالت سمجھے۔ کیا ان کی عدالت کا آداب عدالت ہائیکورٹ کے آداب سے کسی وجہ سے کچھ زیادہ ہے۔ یا ان کی عدالت کے واسطے کوئی خاص عزت ہائیکورٹ کی عزت سے اعلیٰ ہے جس کے سبب سے وہ ایسی زیادتی پر آمادہ ہوئے۔ عدالت ہائیکورٹ کی وہ تمام کارروائیاں جن کو وہ خود کرتی ہے، یا جن کو جائز رکھتی ہے۔ اور عدالتوں کے واسطے قانون سمجھی جاتی ہے۔ پس ہم کو حیرت ہے کہ جس عدالت کی کارروائیاں انفصال خصومات میں قانون سمجھی جاتی ہیں، اس عدالت کی کارروائی آداب عدالت کے باب میں کیوں نہیں واجب الاتباع سمجھی جاتی۔

جوتا پہن کر عدالت کے کسی کمرہ میں جانا خلاف آداب ہی قرار پاوے۔ تو جوتا پہن کر جانے والا صرف اس سزا کا مستوجب ہوگا، جو قانون کی منشاء کے موافق اس شخص کے واسطے مقرر ہے، جو عدالت کی عزت میں خلل انداز ہو۔ اور ہم کو یقین ہے، کہ ایسے مجرم کے واسطے کسی قانون میں یہ سزا نہیں ہے، کہ مجرم کے سر پر پندرہ منٹ تک جوتیاں رکھوائی جائیں، یا وہ شخص ذرہ بھی اپنے مطلب کی تائید کے واسطے زیادہ گفتگو کرے، تو نازک دماغ حاکم اس کے کان پکڑا دے، اور اٹھا دے بٹھا دے۔ یا اس کو ڈیم سور کہہ کر سر اجلاس دو لاتیں لگوا دے۔ یا راہ چلتے شخص کو اس جرم میں پکڑ کر بید لگوا دے، کہ اس نے ہم کو سلام نہیں کیا تھا۔ ایسی سزاؤں کا اپنی طرف سے جاری کرنا جن کے وہ قانوناً مجاز نہیں ہیں۔ انگریزی عدالتوں کی تہذیب اور انصاف میں سراسر بٹہ لگاتا ہے۔ ہم عدالت ہائیکورٹ کے انصاف اور تہذیب کے نہایت مداح ہیں، کہ وہ اپنی غریب رعایا کے ساتھ منصفانہ برتاؤ میں اپنے فرض کو ادا کرتی ہے۔ مگر اس قدر ہم کو اس کی نسبت بھی خیال ہے کہ اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنی عدالت کو انصاف کا ذمہ دار سمجھ لے، اور جو عدالتیں اس کی ماتحت ہیں، ان کی پرواہ نہ کرے، بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ خود عدالت العالیہ اور تمام عدالتوں کے انصاف کا مرجع ہے۔ یہ بھی اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماتحت حکام کی عدالتوں کی بے تہذیبی اور ناانصافی کو بروقت سخت مزاحمت کی نظر سے دیکھے۔ اور جو امور غریب رعایا کی عزت و آبرو کا ذریعہ ہیں۔ ان کی حمایت کرتے رہیں۔ اور جو باتیں رعایا کی بے آبروئی اور اس کی دل شکنی کا سبب ہیں۔ اور ان کا استعمال بے جا اور ناجائز طریقہ سے ہوتا ہے۔ ان کو اپنی عدالت کے زور سے دفع کرتی رہے۔

اس خاص معاملہ میں جس کا ہم نے تذکرہ کیا، ہندوستان کے تمام معزز وکلاء اور مختار کار بلکہ تمام ایسے شریف ہندوستانی جو اپنی قومی ذلت کا سخت صدمہ ہے۔ اس باب میں عدالت ہائیکورٹ کی طرف نہایت امید کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کو اس بات کا بھروسہ ہے، کہ جو کارروائی اس وقت عدالت العالیہ کرے گی، وہ آئندہ کے واسطے ایسے تیز مزاج افسروں کے واسطے ایک عمدہ نظیر ہو جاوے گی۔ پس اگر اس کا مناسب تدارک ہو گیا، تو تند مزاج حاکم اپنی تند مزاجی کو ضبط کرنے کے عادی ہوں گے۔ اور اگر کوئی عدالت ہائیکورٹ نے کچھ نہ کیا، تو یقین کر لینا چاہیئے، کہ گویا آئندہ کے واسطے ہائیکورٹ ہی کی طرف سے ہندوستانیوں کے تذلیل کی ایک نظیر ہو گی۔